سندھیوں کی گردن میں پڑنے والا نیا طوق

”مکانی اداروں کے دو نظام اور صوبے کی تقسیم کے معاملے سے ابھی سندھ کو نجات نہیں مل سکی تھی کہ حکومت نے سندھ میں ذوالفقار آباد کی تعمیر کا کام فوری طور پر شروع کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ 2009ء میں جھرک شہر کے نام سے شروع اس منصوبے کو ذوالفقار آباد کا نام دے کر اسے شہید بھٹو کی سوچ اور فکر سے وابستہ شہر قرار دیا گیا۔ اپنے دورِ اقتدار کے آخری برس پیپلز پارٹی نے اہلِ سندھ کی گردن میں ایک نیا طوق ڈالنے کے لیے اس پر کام کی رفتار بھی تیز کر دی ہے اور سندھ کابینہ نے اس سکیم کو منظور بھی کر ڈالا ہے۔ سندھ کابینہ کے کسی وزیر کو بھی اس سکیم کی تفصیلات کا علم نہیں ہے۔ اہل سندھ کو سکیم کے سود و زیاں کا کچھ پتا نہیں ہے لیکن اس کے باوجود شفافیت اور عوام دوستی کی دعویدار حکومت اس سکیم پر اپنی ساری توانائیاں خرچ کرنے کے لیے بے تاب ہے۔“

اس سکیم پر عمل درآمد کی نگرانی کے لیے 2010ء میں سندھ سرکار کے ایک ایکٹ کے تحت ذوالفقار آباد ڈویلپمنٹ اتھارٹی قائم کی گئی۔ اس کا موجودہ ایم ڈی سید افتخار حسین فوج کا ریٹائرڈ اہلکار ہے۔ اتھارٹی کا سربراہ تو وزیر اعلیٰ سندھ ہے جو اوپر سے آنے والے ہر حکم پر ”قبول ہے“ کے سوا کچھ نہ کہنے کی شاندار تاریخ کا مالک ہے۔ کھربوں روپیہ کی اس سکیم کے بارے میں سرکاری طور پر کوئی تفصیل بیان نہیں کی گئی، تاہم مختلف منتشر دستاویزات، متفرق پریزنٹیشنز اور میٹنگوں سے مندرجہ ذیل معلومات دستیاب ہو سکی ہیں :

ذوالفقار آباد سکیم کی سرکاری ویب سائٹ پر اتنی اہم سکیم کو محض ایک صفحہ میں بیان کیا[61] گیا ہے اور اس مختصر نوٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ کراچی سے 150 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک شہر قائم کیا جائے گا جس کے لیے ساڑھے تین لاکھ ایکڑ زمین حکومت سندھ کی طرف سے مختص کی گئی ہے، جب کہ ساڑھے آٹھ لاکھ ایکڑ سے زائد زمین سمندری کناروں کو قابلِ استعمال بنا کر حاصل کی جائے گی۔ اپریل 2011ء میں اتھارٹی کی طرف سے سکیم کے تصوراتی ماسٹر پلان کے لیے جاری کردہ اظہار دلچسپی پر مبنی نوٹس میں بھی کام کے دائرے کے بارے میں محدود معلومات دیتے ہوئے صرف 13 لاکھ 32 ہزار ایکڑ زمین موجود ہونے کے اعداد و شمار دیئے گئے ہیں۔ سندھ سرکار کے محکمہ ریونیو کے تیار کردہ ایک اور پریزنٹیشن میں اس سکیم کے لیے دو آپشن دیئے گئے ہیں۔ اوّلین آپشن میں ضلع ٹھٹھہ کے 4 تعلقوں کیٹی بندر، کارچھان، جاتی اور شاہ بند کو سکیم کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔ اس آپشن کے تحت پریزنٹیشن میں 12 لاکھ 90 ہزار ایکڑ زمین سکیم کے لیے استعمال ہونے کا کہا گیا ہے جس میں 3 لاکھ 35 ہزار ایکڑ زمین کو ناقبولی اور بیلے کی زمین قرار دیتے ہوئے فوری طور پر موجود ہونے کا بتایا گیا ہے، جب کہ 9 لاکھ 55 ہزار ایکڑ زمین کو بند باندھ کر سمندر کو پیچھے دھکیل کر قابلِ استعمال بنانے کی تجویز دی گئی ہے۔ دوسرے آپشن کے طور پر اس سکیم کو سپر ہائی وے اور نیشنل ہائی وے کے درمیان میں تعمیر کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے جس میں سجاول، میرپور بھٹورو، گھوڑا باڑی، میرپور ساکرو، ٹھٹھہ اور جام شورو میں موجود زمین کے اعداد و شمار دیئے گئے ہیں۔ اس آپشن کے تحت 6 لاکھ 60 ہزار ایکڑ زمین کے قابل استعمال ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ سندھ کی لاکھوں ایکڑ زمین کو قبضہ کر کے استعمال میں لانے اور سندھیوں کے قومی وجود کو نقصان پہنچا سکنے والے اس شہر کی سکیم کے بارے میں سرکاری ادارے اور حکومت خاموش ہیں اور سندھ کے باشندوں کو کچھ بھی بتانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

جوں ہی صدر صاحب نے جون میں اس سکیم کے اہم حصے کے طور پر دھاندھاری کے قریب چھ کلومیٹر کے پونے 4 ارب روپے کی لاگت کے پل کو بنانے کا حکم دیا ہے، حکومت اور چینی سرمایہ کاروں میں روابط بھی تیز ہو گئے ہیں۔ صدر زرداری کے حالیہ دورۂ چین کے موقع پر مفاہمت کی ایک یادداشت پر بھی دستخط کیے گئے ہیں جس کے بعد چینی سرمایہ کاری کے لیے

ذوالفقار آباد میں در مکمل طور پر واہو گئے ہیں۔ اس سے قبل 25 اگست 2011ء میں ایک انگریزی اخبار میں شائع شدہ خبر میں بتایا گیا تھا کہ چینی کمپنیوں نے ذوالفقار آباد میں ایک اکنامک زون تعمیر کرنے کی تجویز دی ہے جس کے مطابق 15 برس کے اندر یہ زون تعمیر کر دیا جائے گا۔ حکومت ان سب کاموں کے لیے اتنی جلدی میں ہے کہ پبلک سیکٹر کی ترقیاتی سکیموں کے بارے ضوابط کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے۔ پاکستان کے پلاننگ کمیشن کے پراجیکٹ مینجمنٹ کی لاگت والی ہر سکیم کی منظوری ECNEC یعنی قومی اقتصادی کونسل کی کاروباری کمیٹی کو دینی ہے، مگر ذوالفقار آباد سکیم ایکنک سے بھی منظور نہ کروا کر قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ پیپلز پارٹی جب اپوزیشن میں تھی تو گریٹر تھل کینال کی سکیم کو ایکنک سے منظور نہ کروانے پر مشرف حکومت پر سخت تنقید کیا کرتی تھی۔ اب پی پی حکومت نے خود اس قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس سکیم کے لیے بجٹ میں رقم بھی رکھ دی ہے۔ اگر یہ سکیم مشرف دور حکومت میں سامنے آتی تو پیپلز پارٹی اسے سندھ دشمن سکیم قرار دے کر ایک طوفان برپا کر دیتی۔

ذوالفقار آباد سکیم سے اہل سندھ کو جو خطرہ فوری طور پر درپیش ہے، وہ ہے سندھ میں سندھیوں کے اقلیت میں تبدیل ہو جانے اور دنیا شہر تعمیر ہونے کی صورت میں لاکھوں افراد کی غول درغول بیرون سندھ سے آمد کا۔ سندھی پہلے ہی تقسیم کے وقت اغیار کی آبادکاری کی وجہ سے کراچی اپنے ہاتھوں سے نکل جانے کا تجربہ بہ چشم خود ملاحظہ کر چکے ہیں۔ تقسیم کے وقت کراچی کی آبادی ساڑھے چار لاکھ افراد پر مشتمل تھی جن میں سندھی بولنے والے 61 فیصد، جب کہ اُردو بولنے والے محض 6.3 فیصد ہی تھے۔ بعد از تقسیم ہونے والی غیر قانونی نقل مکانی کی وجہ سے 1951ء کی مردم شماری کے مطابق شہر کی آبادی ساڑھے گیارہ لاکھ ہو گئی جس میں سندھی کم ہو کر 8.6 فیصد اور اُردو بولنے والی آبادی بڑھ کر 50 ہو گئی۔ بیرونی آبادی کی متواتر یلغار کے نتیجے میں 1998ء کی مردم شماری کے مطابق شہر میں سندھی بولنے والوں کا حصہ صرف 7.22 فیصد ہے۔ مذکورہ مردم شماری کے مطابق سندھ میں سندھی بولنے والے تقریباً 62 فیصد تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سندھی اپنی ہی سرزمین پر اقلیت میں تبدیل ہونے سے محض تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑے تھے۔ اگر ذوالفقار آباد جیسا نیا شہر تعمیر کیا گیا تو اس میں سرمایہ کاری کے لیے کروڑوں بلکہ اربوں روپے کی ضرورت پیش

آئے گی۔ صاف ظاہر ہے کہ دیہی علاقوں میں بہ مشکل زندہ معیشت پر انحصار کرنے والے سندھی اس نئے شہر میں پاؤں رکھنے کے قابل نہیں ہوں گے۔ دیہی سندھ کی معیشت پانی کی لگاتار قلت اور دو بڑے تباہ کن سیلابوں کی وجہ سے تباہ حال ہے اور گزشتہ 6 دہائیوں سے دیہی سندھ میں کوئی نمایاں صنعت کاری نہ ہونے کی وجہ سے سندھی کسی صنعتی سرمایہ کاری کا کوئی تجربہ بھی نہیں رکھتے۔ نتیجتاً سندھی نئے شہر میں جائیداد اور صنعت میں کوئی خاص سرمایہ کاری کرنے سے محروم رہیں گے اور ملک کے دیگر صوبوں نیز بیرونی ممالک سے لاکھوں افراد کے غول سندھ آئیں گے، جس کے بعد سندھی اپنی ہی دھرتی پر اقلیت میں تبدیل ہو کر رہ جائیں گے۔ باہر سے آنے والے لاکھوں افراد سندھ کا ڈومیسائل اور شناختی کارڈ بھی بنوالیں گے اور ووٹ دینے کا حق بھی حاصل کر لیں گے جس کی وجہ سے سندھیوں کا سیاسی مستقبل بھی تاریک ہو جائے گا اور اس سارے عمل میں زیادہ سے زیادہ دس تا پندرہ سال لگیں گے۔ ذوالفقار آباد سے پیپلز پارٹی کے چند افراد تو اربوں پتی بن جائیں گے مگر سندھیوں کا مستقبل داؤ پر لگ جائے گا

ذوالفقار آباد کے ایم ڈی نے ذوالفقار آباد کے لیے چین کے شہر شین ژن (Shen Zhen) کو اپنا ماڈل قرار دیا ہے۔ اس شہر کے بارے میں مختصر معلومات یہ سمجھنے میں مددگار ثابت ہوں گی کہ شین ژن جیسا شہر ذوالفقار آباد اہل سندھ سے کیا کرے گا! چین کے جنوبی علاقے میں پرل (Pearl) ندی کے ڈیلٹا میں واقع یہ شہر ہانگ کانگ کے شمال میں ہے۔ اس شہر کو چین نے 1980ء کے قریب سپیشل زون کے طور پر ترقی دلائی اور اسے سب پراونشل انتظامی درجہ دیا گیا اور چین میں اس سے مراد صوبے کے اندر ایک ایسے شہر سے ہے جو ہوتا تو صوبائی انتظام کے ماتحت ہے مگر اقتصادی اور قانونی پہلوؤں سے انتظامی طور پر الگ ہوتا ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے گویا کہ جس طرح مشرف دور اقتدار میں کراچی کی سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کی حیثیت تھی۔ شین ژن شہر 1979ء تک ماہی گیروں کی ایک بستی تھی جس کی آبادی تقریباً تین لاکھ تھی۔ شہر کو جدید طرز کا معاشی مرکز بنانے کے بعد اب اس کی آبادی تقریباً ایک کروڑ دس لاکھ ہے جس میں 60 لاکھ باہر سے آنے والے ورکر ہیں۔ 1980ء سے قبل اس شہر کے اصلی باشندوں کی زبان کینٹونیز (Cantonese) تھی، اب وہاں کی زبان تبدیل ہو کر منڈارن (Mandarin) بن چکی ہے اور شہر کے اصل باشندے اپنی شناخت اور

کلچر کھو بیٹھے ہیں۔ ٹھٹھہ کے ساحلی اضلاع بھی شین ژن کی طرح ماہی گیروں کی بستیاں ہیں۔ 1998 کی مردم شماری کے مطابق اس کے چاروں تعلقوں کی حالیہ آبادی تقریباً 4 لاکھ ہوگی اور اہل علاقہ سندھی زبان بولتے ہیں، لیکن ذوالفقار آباد شہر کی تعمیر کے بعد سندھی بولنے والے ماہی گیر ان علاقوں سے بالکل اسی طرح عنقا ہو جائیں گے جس طرح کراچی بننے کے بعد ہوا تھا۔ یہ بات محض اس ایک شہر تک ہی محدود نہیں رہے گی بلکہ اس کی وجہ سے صوبے کی ڈیموگرافی بھی مکمل طور پر تبدیل ہو جائے گی اور ایک دو عشروں ہی میں سندھی اپنی ہی دھرتی پر اقلیت میں تبدیل ہو کر رہ جائیں گے۔

چین کی اس خطے میں دلچسپی اور امریکہ سے اس کی معاشی اور عسکری میدان میں شروع ہونے والی سرد جنگ کے بعد چین اس سمندری پٹی پر ایک دوسرے شہر اور بذریعہ پورٹ امریکہ سے سرد جنگ کا نیا میدان سجانا چاہتا ہے۔ امریکہ سے عسکری تعلقات میں کشیدگی در آنے کے بعد پاکستان اسٹیبلشمنٹ اس پر دباؤ بڑھانے کے لیے چین سے تعلقات مضبوط کرنے کے لیے کئی معاہدوں پر کام کر رہی ہے۔ پاکستان کے شمالی علاقوں میں پانی سے وابستہ کئی منصوبوں میں چین کی سرمایہ کاری شامل ہے۔ ان میں بھاشا ڈیم اور اسلام آباد کو پانی فراہم کرنے والی سکیمیں بھی ہیں۔ جنوبی علاقے میں سمندری پٹی پر یہ اہم سرمایہ کاری ہوگی جس سے چین ہندی/عربی سمندری پٹی پر امریکہ سے سرد جنگ میں ایک اہم پیش رفت کر رہا ہوگا۔ ادھر امریکہ چین کے ہمسائے میں موجود بھارت کو دفاعی حکمت عملی کے طور پر نئے معاہدوں کے ذریعے سے اپنا اتحادی بنا رہا ہے جس کا مقصد چین اور پاکستان دونوں پر دباؤ بڑھانا ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ جس طرح گوادر کے منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے منظم خونریزی کروا کر سرمایہ کاروں کو بھگا دیا گیا، اسی طرح سندھ میں چین اور امریکہ کی سرد جنگ کے نتیجے میں صوبے میں امن وامان کی صورت حال کو خراب کر دیا جائے۔ حالیہ چند ماہ میں رونما ہونے والے بعض واقعات سے اس نوع کے اشارے بھی ملتے ہیں جو مزید خطرناک شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ اگر حکومت کو سندھ میں ترقی کے عمل سے کچھ دلچسپی ہے تو کراچی میں ترقی سے محروم سندھی اور بلوچ آبادیوں میں ترقیاتی عمل شروع کرانے کے ساتھ باقی سندھ کے ضلعی ہیڈ کوارٹرز کی ترقی پر وسائل خرچ کرے۔ کراچی سے باہر سندھ کے

43

61

بڑے شہروں میں انفراسٹرکچر انتہائی خراب حالت میں ہے جسے بہتر بنانے کے لیے حکومت ہمیشہ وسائل نہ ہونے کا عذر پیش کرتی ہے۔ سندھ میں کراچی کے علاوہ کوئی بھی شہر صحیح معنوں میں شہر کا منظر پیش کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ سکھر، دادو، میرپور خاص، نواب شاہ، خیرپور، میرس، لاڑکانہ، عمر کوٹ، جامشورو، سانگھڑ، جیکب آباد، گھوٹکی، شکارپور وغیرہ دراصل شہر نما مرکز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سارے ملک اور دوسرے صوبوں کے باشندے بھی کراچی ہی کا رخ کرتے ہیں۔ کراچی سے آبادی کا دباؤ ہٹانے کے لیے اس کا حل ذوالفقار آباد کی تعمیر نہیں بلکہ سندھ کے دوسرے ڈویژنل ہیڈکوارٹر اور ضلعی مراکز کو ترقی دینے میں مضمر ہے۔ اس معاملے میں پنجاب سے سبق سیکھنا چاہیے جس نے لاہور کے ساتھ گجرات، گوجرانوالہ، فیصل آباد، شیخوپورہ، سیالکوٹ، ملتان وغیرہ جیسے دیگر شہری مراکز قائم کر کے آبادی کے دباؤ سے کسی حد تک لاہور کو بچا لیا ہے۔ 1998ء میں جب سندھ کی شہری آباد کا 62 فیصد کراچی میں رہائش پذیر تھا، پنجاب کی شہری آبادی کا صرف 22.3 فیصد لاہور میں رہتا تھا۔ اب بھی اس تناسب میں کوئی غیر معمولی فرق نظر نہیں آتا۔ سندھ میں بیرونی آبادی کی یلغار کا اثر یہ ہوا ہے کہ 1998ء کے اعداد وشمار کے مطابق سندھ کی شہری آبادی میں سندھی بولنے والوں کا تناسب 25.75 فیصد تھا۔ جب پنجاب کی شہری آبادی کا 78.75 فیصد پنجابی سپیکنگ اور خیبر پختونخواہ کی شہری آبادی کا 73.55 فیصد پشتو بولنے والوں پر مشتمل تھا۔ اس پس منظر میں دیکھیے کہ ذوالفقار آباد سندھ کے شہری علاقوں میں سندھی بولنے واوں کے تناسب کو کس طرح اقلیت میں تبدیل کر ڈالے گا۔ اہل سندھ ترقی کے خلاف ہرگز نہیں ہیں، مگر وہ ایسی ترقی کو قبول کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں جو اُن کے وجود اور شناخت کو اُن کی اپنی ہی دھرتی سے معدوم کر ڈالے۔''

ذوالفقار آباد۔ اشرافیہ کے لیے اشرافیہ کا منصوبہ

28 جنوری 2011ء کو صدر کی سربراہی میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں بتایا گیا کہ منصوبے کے لیے ضلع ٹھٹھہ کے چار ساحلی تعلقہ جات میں 1.6 ملین ایکڑ زمین درکار ہوگی۔ نشان زدہ زمین کا 1.2 ملین ایکڑ سے زیادہ رقبہ فی الوقت زیر سمندر ہے۔ بورڈ آف ریونیو کی جانب سے پیش کردہ معلومات کے مطابق شہر کے لیے 1.3 ملین ایکڑ زمین استعمال میں لائی جاسکتی ہے، جس کا 0.96 ملین ایکڑ قابل طب ہے اور 0.36 ملین ایکڑ حصہ فی الفور دستیاب ہے۔

منصوبے کی خاطر زمین حاصل کرنے کے لیے حکومت سندھ کی جانب سے سندھ لینڈ مینجمنٹ اینڈ ڈویلپمنٹ کمپنی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ کمپنی نے 200,000 ایکڑ زمین پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے اسے غیر قانونی مقبوضات قرار دینے میں قطعی تاخیر نہیں کی۔ اس اقدام پر مقامی مچھیروں کی کمیونٹی نے احتجاج کیا، جو اپنے آباؤاجداد کے وقت سے ان علاقوں میں رہائش پذیر ہیں۔ سول سوسائٹی اور سیاسی تنظیموں نے غریبوں کی حمایت کی ہے۔

طریقہ کار کی خلاف ورزی :

منصوبے کو عملی روپ دینے کے لیے حکومت سندھ کی جانب سے 2010ء میں ZDA ایکٹ کے تحت ایک خودمختار ذوالفقار آباد ڈویلپمنٹ اتھارٹی (ZDA) کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق، اتھارٹی صوبائی محکمہ برائے منصوبہ بندی اور ڈویلپمنٹ

سے منظوری حاصل کیے بغیر منصوبے کے تحت کوئی بھی سکیم منظور کرنے کی طاقت سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔[61] اتھارٹی کی ایک اعلیٰ اختیاراتی ایگزیکٹو کمیٹی کو تمام تر فیصلوں کا اختیار دیا گیا ہے۔ صوبے کے چیف سیکرٹری اتھارٹی کے رسمی رکن ہوں گے، رسمی سربراہی وزیر اعلیٰ کے پاس ہوگی جب کہ عملی سربراہ مینجنگ ڈائریکٹر ہوگا، جو فی الوقت ایک ریٹائرڈ ملازم ہے۔ یہ سازشی ادارہ جاتی صورتِ حال منصوبے کو شروع کرنے کے لیے حکومت کی جانب سے ناشائستہ عجلت کی عکاس ہے۔ اس منصوبے کے لیے دکھائی دی جانے والی پھرتی میں، حکومت پاکستان منصوبہ بندی کمیشن کی منصوبوں کے لیے انتظامی راہنما اصولوں کو بھی نظرانداز کر چکی ہے۔ ان راہنما اصولوں کے مطابق 500 ملین روپے سے زیادہ لاگت کے کسی بھی منصوبے کو ECNEC کی اجازت درکار ہوتی ہے۔ تاہم تاحال اس منصوبے کو ECNEC کے سامنے منظوری کے لیے پیش نہیں کیا گیا ہے۔

تاحال پیش امکان (PC-III)، امکان (PC-II) اور منصوبے کی دستاویزات (PC-I) میں سے کوئی بھی ایسی چیز دستیاب نہیں ہے جو منصوبے کی تکنیکی اور دیگر تفصیلات بیان کرے۔ ہر پبلک سیکٹر یا پبلک۔ پرائیویٹ اشتراک کے منصوبے کے لیے ان دستاویزات کی موجودگی لازمی ہوتی ہے، بہ صورتِ دیگر منصوبے کو غیر قانونی یا خلافِ ضابطہ قرار دیا جاتا ہے۔

مقامی آبادیوں کے حقوق :

عالمی پیمانے پر ساحلی پٹی کو تجارتی سرمایہ کاری، مثلاً رہائش، سیاحت، صنعت اور تجارت کے لیے پُرکشش مقام تصور کیا جاتا ہے۔ انتہائی مہنگے رہائشی منصوبے ساحلی قصبوں اور شہروں کے ساتھ قائم کیے گئے ہیں۔ کچھ تخمینوں کے مطابق اندازاً زمین پر تین بلین افراد ساحل کے 200 کلومیٹر علاقے میں رہائش پذیر ہیں جب کہ دنیا کے 17 میں سے 14 بڑے شہر ساحلی پٹی پر واقع ہیں۔ یہ ترقی اکثر مقامی آبادیوں کی قیمت پر عملی روپ دھارتی ہے۔ اس پس منظر میں سول سوسائٹی نے اس منصوبے کی سماجی و ماحولیاتی مضمرات پر سنجیدہ خدشات کا اظہار کیا ہے۔ یہ ظاہر ساحلی دیہاتوں سے ہزاروں افراد کی غیر رضاکارانہ منتقلی کی منصوبہ بندی ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

پانی کی ضرورت :

دس افراد کی آبادی کے حامل شہر کو بھی مناسب پانی کی ضرورت ہو گی۔ کراچی شہر کا تجربہ ہمیں سکھاتا ہے کہ اس حیات بخش سہولت کی کارکردگی اور ساکھ کے ذمہ دار ادارے ہوتے ہیں۔ پانی کی کھپت کے معیارات کے مطابق 16 ملین رہائشی افراد کے حامل شہر کو روزانہ تقریباً 600 ملین گیلن پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کراچی شہر کی آبادی کے غلط امداد و شمار اس مقدار کے 1000 مین گیلن روزانہ تک کا مطالبہ کرتے ہیں۔ صنعتوں کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے مزید 123 ملین گیلن روزانہ پانی کی ضرورت ہے۔ اس قلت کے باعث کراچی شہر میں پینے کے پانی کی طلب و رسد کے درمیان فاصلے کو گھٹانے کے لیے K-IV منصوبے کا آغاز کیا گیا ہے۔ یہ دریائے سندھ میں سے 1200 کیوسک اضافی پانی کا رخ تبدیل کرے گا جس کا نتیجہ ٹھٹھہ کی 300,000 ایکڑ زرعی زمین کے متاثر ہونے کی صورت میں نکل سکتا ہے (روزنامہ ڈان: 25 مئی 2012ء)۔ دریائے سندھ کی انتظامی اتھارٹی، ارسا (IRSA) کراچی کے لیے پانی کی اس رسد کو تربیلا ڈیم سے پوری کرنے کے لیے پہلے ہی انکار کر چکی ہے۔ اس شہر کو چھوٹا پاکستان قرار دیا جاتا ہے لیکن جب پانی کی ضرورت کا مرحلہ آتا ہے تو صوبہ سندھ سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے حصے کے پانی کی قربانی دے۔

حکومت سندھ اور ایشیائی ترقیاتی بینک کے سندھ کے ساحلی علاقوں کے ترقیاتی منصوبے کے تحت کیے جانے والے ”ساحلی علاقوں کے بیس لائن سروے“ کے مطابق، یہ چار تعلقے 0.14 ملین ایکڑ سے زیادہ زمین پر بہت سی فصلیں، سبزیاں اور پھل اُگاتے ہیں۔ شہر سے پانی کا رُخ موڑنے کی صورت میں زرعی زمینیں آب پاشی کے بغیر رہ جائیں گی جس کے نتیجے میں آبادیاں اپنے ذریعہ معاش سے محروم ہو جائیں گی۔ کراچی کے تجربے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹینکر مافیا کو اپنے کاروبار کا نیا سود بخش مرکز تجارت سے میسر آجائے گا۔ اس پانی کی قیمت کون ادا کرے گا؟ ظاہر ہے کہ غریب مقامی آبادیاں۔

ماحولیاتی مسائل

دریائے سندھ پاکستان کے ماحولیاتی ورثے کے تاج کا قیمتی[61] ہیرا ہے۔ اس کے زرخیز حیاتیاتی تنوع کے لیے، ڈیلٹا کو رامسر علاقہ قرار دیا گیا ہے بڑے پیمانے پر ماحولیاتی اہمیت کا حامل ہے۔ تازہ پانی کے بہاؤ میں کمی کے باعث انڈس ڈیلٹا پہلے ہی متاثر ہوا ہے جس کا نتیجہ سمندری مداخلت کی صورت میں نکلا ہے۔ مذکورہ چار تعلقے ڈیلٹا کے انتہائی متاثرہ علاقوں میں واقع ہیں۔ ذوالفقار آباد منصوبے کے حامی شور مچاتے ہیں کہ مدوجزر والے علاقوں میں زمین پر دوبارہ قبضے کے ذریعے سمندری مداخلت کو روکا جائے گا اور یوں زمین سمندر کی مزید مداخلت سے محفوظ ہو گی۔ اگر حکومت علاقے کی زمین کو محفوظ کرنا چاہتی ہے تو ایک مناسب تعمیر کردہ بند اس ضرورت کو پورا کر سکتا ہے۔ نئے شہر کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ زمین محفوظ ہو سکے لیکن مقامی غریب آبادیوں کے لیے فائدہ مند نہیں ہو گی۔ دستیاب زمین نجی شعبے کے سرمایہ کاروں کے لیے پُرکشش ثابت ہو گی۔ WWF پاکستان کی ایک دستاویز کے مطابق، وہ علاقہ جہاں شہر کے قیام کی تجویز ہے، ملک کے بقیہ مینگروو سے ڈھکے علاقوں کا تقریباً 50 فیصد ہے جن میں سے اکثریت کو 1950ء کی دہائی سے محفوظ قرار دیا گیا ہے۔ مذکورہ مقام کی زمین کے موجودہ ہسپتال کے حوالے سے حالیہ تحقیقات اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ بہت سے بڑے اور چھوٹے خلیجوں میں مینگرو جنگلات، مرطوب دلدلوں اور سمندری پانی سے علاقے کے کل رقبے کا بالترتیب 7.2، 40.2 اور 20 فیصد حصہ ڈھکا ہوا ہے (WWF پاکستان)۔ بقیہ ایک تہائی حصہ اندرونی علاقہ ہے جو تقریباً 9 فیصد حصے پر زراعت اور دیسی سبزیوں اور ذوالفقار آباد کے مجوزہ کل رقبے میں سے 24 فیصد غیر آباد زرعی زمین اور رہائشی علاقوں پر مشتمل ہے۔ مجوزہ رقبے کی 135000 ایکڑ سے زیادہ زمین مینگرو جنگلات سے ڈھکی ہوئی ہے۔ ان جنگلات کا تقریباً نصف حصہ محفوظ علاقے میں واقع ہے جو سندھ محکمہ جنگلات کے انتظامی دائرہ اختیار میں آتا ہے، لیکن کسی بھی مرحلے پر محکمے سے مشاورت نہیں کی گئی ہے۔ اسی طرح اس نوعیت کے منصوبے کے لیے پاکستانی ایکٹ برائے تحفظِ ماحولیات کے تحت ایک ماحولیاتی اثرات کے جائزے کی ضرورت ہوتی ہے (جس کا ایک جز سماجی اثرات کا جائزہ ہے)۔ منصوبے کی وسعت کے پیشِ نظر مثالی طور پر حکمتِ عملی کے اثرات کا جائزہ بھی لینا چاہیے۔ تاہم ان تمام لوازمات کی برملا خلاف ورزی ہوئی ہے۔

قدرتی آفات کی زَد میں

سمندری علاقوں کو اب مزید صحت بخش مقامات تصور نہیں کیا جاتا۔ ماحولیاتی خطرات اور ساحلی آفات نے ایسے شہروں کو مزید خطرناک بنا دیا ہے۔ 2004ء میں مشرقی ایشیائی ساحل اور 2011ء میں جاپان کے سونامی ساحلی شہروں پر منڈلاتے خطرات اس کے واضح شواہد فراہم کرتے ہیں۔ سیاحت، صنعت، جہازی اور آبی ثقافت کے شعبے سرمایہ کاروں کی دل چسپی کا محور ہیں۔ قدرتی ماحولیاتی نظام ان علاقوں میں بہ تدریج بگڑ رہا ہے اور آخر کار ٹھوس اور سخت ہو چکا ہے۔ مشرقی ایشیائی ممالک سے ٹکرانے والے سونامی نے وسیع پٹی پر مینگرو جنگلات کا خاتمہ کر کے 9 بلین ڈالر کی جھینگا صنعت تشکیل دی ہے۔ 2001ء کے سونامی کے نتیجے میں ہونے والی وسیع و عریض تباہی کے باعث وہ تمام معیشت، جس کا دعویٰ ان ممالک کی جھینگا صنعت کرتی تھی، ڈھہ گئی۔ مینگرو جنگلات سونامی کے اثرات میں کمی لا سکتے تھے۔ کچھ اطلاعات کے مطابق، سندھ کا ساحل ایک صدی میں اوسط چار طوفانوں کا سامنا کرتا تھا، تاہم اس کی کثرت اور شدت میں کئی طرح کے اضافے ہوئے ہیں اور 1971ء سے 2001ء کے عرصے میں 14 طوفان ریکارڈ کیے گئے۔ 2001ء سے 2010ء کے درمیان دو انتہائی شدت کے طوفان آئے، جیسے یمین طوفان اور فیٹ طوفان سندھ کے ساحل کے بے حد قریب سے گزرے۔ چناں چہ ذوالفقار آباد کو سنجیدہ خطرات لاحق ہوں گے۔ کراچی کا تجربہ ثابت کرتا ہے کہ ساحلی علاقوں میں شہری ترقی مینگرو و جنگلات اور ساحلی ماحولیات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتی ہے۔ گزشتہ کئی دہائیوں میں کراچی کا ساحل اپنے قیمتی مینگرو درختوں کا بیشتر حصہ ضائع کر چکا ہے۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ، پورٹ قاسم اتھارٹی اور سندھ محکمہ جنگلات اپنے تمام تر بلند و بانگ دعوؤں کے باوجود مینگرو کے وسیع کٹاؤ کو روکنے میں ناکام رہے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق، سندھ ڈیلٹا میں مینگرو کے خاتمے کی شرح 2.3 فیصد سالانہ ہے، جو ماحولیاتی تباہی ہے۔ ذوالفقار آباد مینگرو و درختوں کی چھاؤں ختم کر کے ان علاقوں میں ساحلی تباہی کے خطرات کو مزید بڑھاوا دیتا ہوا نظر آتا ہے۔

نئے شہر کے لیے منتخب کردہ زلزلوں کا فعال علاقہ ہے۔ زلزلے کے باعث ہونے والی

صدیوں پرانی تباہیوں کے اثرات موجود ہیں۔ کچھ مورخین کے مطابق[61] 893 عیسوی میں آنے والے ایک زلزلے نے سندھ ڈیلٹا میں دیبل کا تاریخی مقام برباد کر دیا تھا۔ مجوزہ شہر اللہ بند فالٹ کے نزدیک زلزلے کے فعال علاقے پر واقع ہے، جسے شدید زلزلے کا ممکنہ خطرہ لاحق ہے۔ اس کے جنوب مشرق میں گجرات کا زلزلے والا علاقہ (GSZ) اور شمال مغرب میں مکران کا زیریں علاقہ (MSZ) واقع ہے جس سے مجوزہ شہر کو سنجیدہ خطرات ہیں۔ اس کی سرحد کے ساتھ ملحق علاقوں میں 2001ء کا بھوج زلزلہ تباہی کا باعث بنا تھا۔ اس شدید زلزلے میں 18500 لوگ مارے گئے تھے۔ یہ زلزلہ کراچی میں بھی محسوس کیا گیا تھا جہاں چند عمارات میں دراڑ پڑ گئی۔ بدین اور تھرپارکر کے ضلعوں میں بھی اس کی شدت محسوس کی گئی اور نقصان پہنچا۔

لہٰذا ذوالفقار آباد کو زلزلہ محفوظ ڈھانچے پر قائم کرنے کے لیے بے انتہا وسائل درکار ہوں گے جب کہ 150 کلومیٹر دور واقع کراچی میں بھی زلزلے کے جھٹکے محسوس کیے جاتے ہیں۔

غلط ترجیحات

سندھ میں غیر منظم ڈھانچے اور غیر معیاری سہولیات کو دیکھتے ہوئے، کسی بھی شخص کو اچنبھا ہو سکتا ہے کہ ان وسائل کو صوبے میں پہلے سے موجودہ ڈھانچوں اور سہولیات کو بہتر بنانے میں کیوں نہیں لگایا جا سکتا۔ صوبے کا بڑا حصہ گاڑیوں کے لیے شاہراہوں، مربوط سڑکوں اور ثانوی شہروں میں بنیادی ڈھانچے سے محروم ہے۔ سندھ کے بڑے شہروں اور ثانوی قصبوں میں رہائش، پینے کا پانی اور حفظانِ صحت کی سہولیات موجود نہیں ہیں۔ ہزاروں سکول اور صحت کے مراکز بنیادی سہولیات سے محروم ہیں لیکن حکومت نے تیزی سے بگڑتے ہوئے ڈھانچوں اور سہولیات کو نظر انداز کیا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر، سرکاری اعداد و شمار کے مطابق سندھ میں 10722 سکول عمارات کے بغیر 24559 سکول پینے کے پانی کی سہولت کے بغیر موجود ہیں (سندھ معاشی سروے 2009-2011ء)۔ یہی دستاویز کہتی ہے کہ ''سندھ میں صحت کی سہولیات کی فراہمی واضح طور پر ناکافی ہے''۔ صوبے کے پاس ہر 10000 افراد کے لیے صرف 3.5 ڈاکٹر اور 1.1 نرسیں ہیں۔ 2010ء اور 2011ء کے آخری دو سیلابوں کے دوران، سندھ کو انتہائی نقصان کا سامنا ہوا۔ تقریباً

50000 گاؤں متاثر ہوئے جب کہ اندازاً 2.5 ملین گھروں کو نقصان پہنچا۔ 2010ء کے سیلابوں کے نتیجے میں ہونے والے نقصانات کے جائزے کے مطابق، عوامی و نجی ڈھانچوں کو پہنچنے والے نقصان کی مالیت 372 بلین روپے ہے۔ 2011ء کے سیلاب پہنچنے والا نقصان بھی اس سے کم نہیں۔ صوبائی حکومت کے پاس متاثرہ ڈھانچے کی مرمت کے لیے رقم ناکافی ہے۔ کراچی سے آبادی کا دباؤ کم کرنے کے لیے مزید دانش مند حکمتِ عملیوں کی ضرورت ہے۔ سندھ میں دیہی، شہری ہجرت درحقیقت غربت میں اضافے، زمینوں پر دباؤ اور پانی کے وسائل جیسے مسائل کا سبب ہے جب کہ دیہی علاقوں میں امن وامان کی صورت حال دیہی آبادی کو زندگی کے بہتر مواقع کے حصول کے لیے شہری علاقوں میں ہجرت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس منظرنامے میں ذوالفقار آباد ایک غلط ترجیح ہے جس کا حاصل دوراندیشی سے خالی میگا سٹی بنانے میں لاکھوں ڈالرز جھونکنے کے سوا کچھ نہیں۔

سرد جنگ کے نئے دور میں کراچی کی اہمیت

جب سے پاکستان میں نئے صوبوں پر بحث کا آغاز ہوا ہے، سرائیکی اور ہزارہ صوبے کی تحریکوں کے بعد سندھ میں مہاجر صوبے کے ڈرامے کو بھی آگے بڑھایا جارہا ہے۔ شہر کی مخصوص آبادی میں شروع کیے گئے چھوٹے چھوٹے مظاہروں اور پوسٹرز کا سلسلہ آگے بڑھ کر ریڈ زون میں خواتین کے جلوسوں تک پہنچایا گیا ہے۔ ریڈ زون جہاں اگر غریب اساتذہ بھی کوئی مظاہرہ کرنے کی جرأت کر بیٹھیں تو ان کا استقبال لاٹھیوں اور آنسو گیس سے کیا جاتا ہے، اس حساس علاقے میں سینکڑوں خواتین کو بسوں میں بھر کر لانے اور سندھ کی تقسیم کے لیے مظاہرہ کرنے کی اجازت کس نے دی؟ اس سوال کا جواب بڑا سادہ ہے اور اس کے لیے اعلیٰ فہم و فراست درکار نہیں۔ شہر میں لگنے والے بل بورڈز اور چاکنگ کا نوٹس لینے کی کارروائی میں اتنی تاخیر کرنے والی سندھ حکومت کی خاموش رضامندی کا ایک ہی مقصد ہے کہ سندھی عوام کو بلیک میل کر کے ووٹ لیے جائیں کہ اگر سندھ کے ووٹ پیپلز پارٹی کو ملنے کے بجائے تقسیم ہو گئے تو حکومت ان لوگوں کو ملنے کا خدشہ ہے جو سندھ کی تقسم کے خواہاں ہیں۔

سندھ میں لسانی بنیادوں پر صوبے کے قیام کا مطالبہ نیا تو نہیں، ماضی میں جناح پور کے نقشوں سے بھی قبل 1972ء میں مرزا جواد بیگ کی جانب سے شہر میں میٹرو پولیٹن حکومت تشکیل دینے کا مطالبہ اور منصوبہ بھی لوگوں کے ذہنوں سے فراموش نہیں ہوا ہوگا۔ میٹرو پولیٹن حکومت کا یہ تصور مشرف کی جانب سے کراچی کو شہری حکومت قرار دے کر سفید و سیاہ کا مالک بنانے سے مختلف

نہ تھا۔ مرزا جواد بیگ کی اس تحریک میں بھی میٹرو پولیٹن حکومت نہ بننے کی[61] صورت میں کراچی کو ایک صوبہ بنانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اب بھی بلدیاتی اداروں کے نظام میں کراچی کو مطلوبہ شہری ریاست جیسی حیثیت حاصل نہ ہوسکنے کے بعد الگ صوبے کا ڈرامہ شروع کیا گیا ہے۔ اس مہم کے دوران پس پردہ بڑی عالمی طاقتوں کے کیا مفادات پنہاں ہوسکتے ہیں، اس منصوبے میں ان کا جائزہ لیا گیا۔

کراچی کو الگ شہری ریاست بنانے میں بڑی طاقتوں کے مفادات کو سمجھنے کے لیے پہلے کراچی کے موجودہ جغرافیائی محل وقوع کو سمجھتے ہیں:

کراچی جنوبی ایشیا میں بحیرہ عرب کے ساحل پر واقع ہے۔ بحیرہ عرب اور بحر ہند کے ساحلوں پر کراچی کے مشرق اور جنوب میں ایشیا اور بحرالکاہل کے بڑے ساحلی شہر آباد ہیں جن میں ممبئی، مدراس، کولمبو، کولکتہ، ینگون، ملاکا، سنگاپور، بنکاک، ہانگ کانگ اور تائیوان کے علاوہ چین، جاپان اور کوریا کے ترقی یافتہ جدید صنعت و ٹیکنالوجی کے علمبردار ساحلی شہر شامل ہیں۔ کراچی کے جنوب مسقط، دبئی، ایران اور اس سے آگے سعودی عرب کا راستہ ہے۔ جنوب مغربی سمت براعظم افریقہ ہے جو قدرتی وسائل کے باوجود بھوک اور بدحالی کا شکار رہا ہے تاہم رفتہ رفتہ بین الاقوامی تجارت میں اہم خطہ کے طور پر اُبھر رہا ہے۔ ان تمام ساحلی ممالک اور شہروں کا نقشہ سامنے رکھنے سے کراچی کے جغرافیائی محل وقوع کی اہمیت خود ہی اجاگر ہو جائے گی۔ شہر کی دو بندرگاہیں کراچی پورٹ اور قاسم پورٹ اس کی جغرافیائی اہمیت کو دوچند کر دیتی ہیں جبکہ مغرب میں گوادر اور مشرق میں کیٹی بندر کی صورت میں مستقبل کی بندرگاہ اس ساحلی پٹی کی سٹریٹجک اہمیت کو مزید بڑھا دیتی ہے۔ سندھ کی ساحلی پٹی کے نزدیک تھرکول کی صورت میں توانائی کا انمول ذخیرہ اس تمام پٹی کی سیاسی اور اقتصادی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ کر دیتا ہے۔ واضح رہے کہ ساحلی پٹی کو ساری دنیا میں معاشی لحاظ سے اہم ترین علاقہ تصور کیا جاتا ہے۔ دنیا کی سات ارب آبادی میں سے اس وقت تین ارب کے لگ بھگ نفوس ساحلی پٹی کے 200 کلومیٹر کے اندر آباد ہیں اور ساحلی شہروں میں آبادی کی کثافت 80 نفوس فی مربع کلومیٹر ہے جو اوسط کثافت سے دوگنا ہیں۔ اس پس منظر میں کراچی کی معشی اور سیاسی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

بحر ہند، بحیرہ عرب اور جنوبی چینی سمندر کو اس لیے بھی معاشی اور عسکری اہمیت حاصل ہے کہ چین، جاپان اور بھارت جیسی تین اہم اقتصادی اور عسکری قوتیں اس خطہ میں واقع ہیں۔ گزشتہ دو دہائیوں کے دوران چین نہ صرف ایک زبردست معاشی قوت بن کر ابھرا ہے بلکہ اپنی عسکری اور سفارتی طاقت کے ذریعے وہ ایشیا، بحرالکاہل اور افریقہ میں امریکی مفادات کے لیے رفتہ رفتہ تشویشناک صورت حال اختیار کرتا جا رہا ہے۔ جاپان، فلپائن، تائیوان، کوریا اور بھارت جیسے پڑوسی ممالک سے کشیدہ سرحدی تعلقات کے باوجود ان ممالک کے ساتھ ساتھ پاکستان، ایران، روس اور متعدد افریقی ممالک کے ساتھ گہرے اقتصادی تعلقات قائم کر کے چین ان خطوں میں امریکی مفادات کے لیے کوئی بڑا خطرہ نہ سہی تاہم باعث تشویش ضرور بنا ہوا ہے۔ اس خطہ میں پاکستان اور افغانستان ایسے دو بڑے ممالک ہیں جہاں امریکہ نے اپنے قدم کسی حد تک جما رکھے ہیں اور ہزاروں کلومیٹر فاصلہ کے باوجود وہ اس خطہ کی اہم عسکری طاقت بنا ہوا ہے۔ خطے میں چین کے بڑھتے ہوئے عسکری اثر ورسوخ پر ضابطہ رکھنے کے لیے امریکہ، فلپائن اور جاپان سے بہتر عسکری تعلقات استوار کرنے کے ساتھ ساتھ جنوبی ایشیا، بحر ہند اور بحیرہ عرب و چین میں فوجی قوت کا توازن اپنے حق میں بہتر بنانے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھا رہا ہے۔ افغانستان میں براہ راست جنگ اور ایران کے ساتھ سرد جنگ میں اپنی سفارتی اور عسکری قوت کا بڑا حصہ صرف کرنے والا امریکہ اس خطے میں چین کے نفوذ کو روکنے کے لیے مختلف حکمت عملیوں کی تشکیل اور ان پر عملدرآمد میں مصروف ہے۔ خطے کے بحری نقشہ کا بغور جائزہ لیا جائے تو دو اہم بحری راستے نظر آتے ہیں: مشرقی سمت آبنائے ماکا ہے جس کی ایک جانب سماترا کا جزیرہ اور دوسری جانب ملائیشیا اور سنگاپور واقع ہیں۔ کراچی کے مغرب میں آبنائے ہرمز ہے جو بحیرہ عرب کو خلیج فارس سے منسلک کرتا ہے۔ ان دونوں آبنائے کے درمیان کراچی واقع ہے، اگرچہ کراچی آبنائے ہرمز کے زیادہ قریب ہے۔

اب ان دو بحری راستوں کی اہمیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ آبنائے ملاکا جنوبی چینی بحیرہ کو بحر ہند سے جوڑتا ہے۔ براعظموں کے درمیان ہونے والی تجارت کا 90 فیصد سمندر کے ذریعے ہوتا ہے جبکہ تیل کی دو تہائی ترسیل بھی بحری راستوں سے ہوتی ہے۔ ایک تخمینہ کے مطابق بحری

راستوں سے ہونے والی تجارت سے وابستہ 50 فیصد بحری جہاز آبنائے ملاکا[61] سے گزرتے ہیں جو بعدازاں بحر ہند میں داخل ہوتے ہیں جبکہ دنیا کے نصف بحری ٹینکر اس سمندری خطے کو استعمال کرتے ہیں۔ خلیج فارس اور مشرق وسطیٰ اور بحرالکاہل کے درمیان پیٹرولیم مصنوعات کی تجارت کا 70 فیصد بحری راستوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ بھارت اور چین کے اقتصادی قوت کے طور پر سامنے آنے کے ساتھ ہی اس سمندری خطہ سے پٹرولیم اور تجارتی مصنوعات کی بحری ترسیل میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 2030ء تک دنیا میں توانائی کا نصف استعمال صرف بھارت اور چین میں ہوگا۔ اس وقت امریکہ کے بعد چین دنیا کی دوسری بڑی معیشت ہے اور اس تناسب سے اس کی توانائی ضروریات بھی بڑھ رہی ہیں، توانائی کی دوڑ میں جاپان تیسرے جبکہ بھارت چوتھے نمبر پر ہے۔ توانائی ضروریات کے 90 فیصد کو پورا کرنے کے لیے تیل پر انحصار کرنے والے بھارت اور چین کے لیے آبنائے ملاکا اور آبنائے ہرمز اہم بحری راستے ہیں۔ بھارت 2025ء تک توانائی کے استعمال کی دوڑ میں جاپان کو پیچھے چھوڑ دے گا جبکہ توانائی کے تین اہم مراکز بھی اس خطہ میں ہوں گے۔ چین کی معاشی شرح نمو گزشتہ تین دہائیوں کے دوران 10 فیصد سالانہ کے قریب رہی ہے۔ 1995ء سے 2005ء کے دوران چین کی تیل کی کھپت دوگنا ہو چکی ہے۔ سعودی عرب کی تیل کی پیداوار کا نصف حصہ چین کو برآمد ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر چین کے تیل کا 85 فیصد آبنائے ہرمز اور آبنائے ملاکا سے گزرتا ہے۔ آبنائے ملاکا کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کرنے والی اہم علاقائی اقتصادی قوتوں میں جاپان، کوریا، تائیوان، فلپائن، ہانگ کانگ، سنگاپور، کمبوڈیا، ویت نام، تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور ملائیشیا شامل ہیں۔ یعنی جنوب مشرقی ایشیا کی اہم تجارتی اقوام کا زیادہ انحصار اس بحری راستے پر ہے۔ مغربی سمت میں سری لنکا، بنگلہ دیش اور بھارت واقع ہیں جہاں اہم تجارتی بندرگاہیں موجود یا زیر تعمیر ہیں۔

دوسری جانب سعودی عرب، ایران اور متحدہ عرب امارات کے تیل کا گزر آبنائے ہرمز سے ہوتا ہے۔ یہ خطہ اس وقت تیل کی فراہمی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور دنیا کے تیل کا قریباً 40 فیصد اس آبنائے سے گزرتا ہے۔ 2011ء میں آبنائے ہرمز سے اوسطاً پونے دو کروڑ بیرل یومیہ تیل کی ترسیل ہوتی رہی ہے۔ اس کا 85 فیصد تیل ایشیائی ممالک، جاپان، بھارت، جنوبی کوریا اور

چین کو جاتا رہا ہے۔ اس تناظر میں آبنائے ہرمز سٹریٹجک لحاظ سے نہایت حساس ہے۔ آبنائے ہرمز سے 240 میل کے فاصلہ پر گوادر کی بندرگاہ ہے۔ یاد رہے کہ 250 ملین ڈالر لاگت سے تعمیر ہونے والی گوادر بندرگاہ کا 80 فیصد سرمایہ چین نے فراہم کیا ہے۔ گوادر میں چین کی موجودگی کا مقصد ہے کہ آبنائے ہرمز سے گزرنے والے تیل کے کنٹینرز کی عملی نگرانی کرنا۔ دوسری جانب جنوب مشرقی سمت سری لنکا کے ساحلی شہر ہمبنتوتہ کے قریب کولمبو سے بھی بہتر اور جدید بندرگاہ زیر تعمیر ہے۔ کروڑوں ڈالر مالیت کے اس منصوبے کے لیے سرمایہ چین کے امپورٹ ایکسپورٹ بینک سے حاصل کیا گیا ہے۔ بظاہر تجارتی نوعیت کے اس منصوبہ کے ذریعے چین خطہ میں اپنی موجودگی کو مزید مستحکم بنا سکتا ہے۔ بنگلہ دیش کے ساحلی شہر چٹاگانگ میں کنٹینرز کے لیے بڑے سہولتی منصوبہ میں بھی چین شامل ہے۔ وہ دنیا بھر کی سخت تنقید کا شکار میانمر کے فوجی آمروں کی بھی دل کھول کر امداد کرتا رہا ہے تاکہ اس سمندری خطہ میں اپنے قدم مضبوط کر سکے۔ میانمر میں سڑکوں اور پائپ لائن منصوبوں کے علاوہ بحری تنصیبات کی تعمیر میں بھی چین کی مالی معاونت شامل ہے۔ اس سمندری خطے میں اپنے قدم جمانے کی پرامن ترقی سے متعلق پالیسی کو چین موتیوں کی مالا (String of Pearls) کا نام دیتا ہے۔ موتیوں کی یہ مالا درحقیقت سیاسی اور معاشی طاقت کے فروغ کی پالیسی ہے۔ افریقہ میں اپنا اقتصادی اثر بڑھانے کے لیے چین نے بڑے تجارتی معاہدے کیے ہیں۔ 2004ء میں چین نے افریقہ میں 900 ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کی۔ قبل ازیں 2000ء میں اس نے افریقہ کے 1.2 ارب ڈالر کے قرضے معاف کیے تھے، جبکہ 2003ء میں مزید 750 ملین ڈالر کے قرضے معاف کیے گئے۔ 2006ء میں چین کی جانب سے اس خطہ میں 60 ارب ڈالر کے تجارتی معاہدے کیے گئے اور اس طرح 2007ء تک چین افریقہ میں 100 ارب ڈالر کی براہ راست سرمایہ کاری کر چکا ہے۔ نتیجتاً اب چین اپنے تیل کا تقریباً ایک تہائی افریقی ممالک سے درآمد کر رہا ہے۔ سوڈان، گنی، کانگو، نائیجیریا اور انگولا چین کے لیے تیل کے اہم ذرائع ہیں۔ تیل کی ترسیل کے لیے بحر ہند اور آگے چل کر آبنائے ملاکا کا استعمال ہوتا ہے۔

اب بحر ہند/بحیرہ عرب کے مجموعی نقشہ میں کراچی کے محل وقوع کے بغور مشاہدہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امریکہ اور چین اس خطہ میں ایک شدید سرد جنگ میں مصروف ہیں۔

افغان جنگ سے دامن چھڑانے کے بعد امریکہ کو اس سرد جنگ کے لیے[61] زیادہ مسائل اور وقت دستیاب ہو سکے گا۔ آبنائے ہرمز کے قریب ایران کے ساتھ امریکہ کا تنازعہ دن بدن شدت اختیار کر رہا ہے جبکہ چین کے ساتھ فلپائن اور تائیوان کے تنازعہ میں بھی امریکہ بلاواسطہ فریق بنا ہوا ہے۔ جنوبی ایشیائی بحیرہ عرب اور بحر ہند میں امریکہ کو پاکستان اور متحدہ عرب امارات تک بہتر سیاسی اور عسکری رسائی حاصل ہے تاہم پاکستان کی سیاسی اہمیت یکسر مختلف ہے، اس لیے اس خطہ میں چین کے فوجی، معاشی اور سیاسی اثر کو روکنے کے لیے پاکستان سرد جنگ کے اس دور میں امریکہ کے لیے نہایت اہم ہے۔ ان حالات کے پیش نظر سیاسی بارگیننگ کے طور پر بلوچ رہنماؤں نے امریکی کانگریس کی خصوصی کمیٹی میں بلوچستان سے متعلق بحث کے دوران امریکہ کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ آزادی کی جدوجہد میں مدد کے بدلے وہ گوادر پورٹ کا انتظام امریکہ کے حوالے کرنے اور ایران پاکستان گیس پائپ لائن منصوبہ کے خاتمے میں مدد کریں گے۔ چین کے زیر اثر گوادر بندرگاہ پر تسلط کی خاطر امریکہ کے لیے یہ پیشکش بظاہر پرکشش ہوگی۔ اگر یہاں سے چند سو میل کے فاصلہ پر کراچی کی بندرگاہ بھی ایسی ہی کسی وفادار قوت کے زبردست ہو تو امریکہ کو اور کیا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ کراچی میں ایم کیو ایم اور اے این پی دونوں کراچی کی ملکیت کے دعویٰ پر خونریزی میں مصروف ہیں۔ دونوں فریقین امریکہ کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ کراچی کی اصل قوت وہ ہیں، جب تک اے این پی نے کراچی کی سیاسی ملکیت کا دعویٰ نہیں کیا تھا ایم کیو ایم کو پشتونوں سے کوئی شدید مسئلہ نہیں تھا۔ اب کراچی کو الگ صوبہ بنا کر اسے ساحلی پٹی اور تھر تک توسیع دینے کی بات کر کے ایک فریق امریکہ کو یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ ہمیں یہ شہر اور ساحلی پٹی مل جائے تو بحیرہ عرب میں ایک وفادار قوت آپ کی معاونت کے لیے دست بستہ حاضر ہوگی۔ گوادر اور کراچی جیسی بندرگاہوں والے اہم شہر امریکی وفادار قوتوں کے زیر تسلط ہونے سے جنوبی ایشیا میں چین کی عسکری توسیع کے سدباب میں امریکہ کو ایک قابل اعتماد سہولت دستیاب ہو سکے گی۔ یہاں بیٹھ کر ایران کو ان بھی آنکھ دکھائی جا سکتی ہے اور چین پر بھی رعب جمایا جا سکے گا۔ اس تصوراتی خاکے میں کراچی سمیت پاکستان کی تمام ساحلی پٹی کی علیحدگی کے معاملے کو سمجھا جا سکتا ہے۔ پاکستان کی ملٹری اسٹیبلشمنٹ پر مکمل اعتماد کے فقدان کے باعث امریکہ کے لیے ساحلی

شہروں کا کسی وفادار قوت کے پاس ہونا سیاسی اور عسکری لحاظ سے بہت اہم ہے، جیسے جیسے پاکستان کی ملٹری اسٹیبلشمنٹ سے امریکہ کے تعلقات خراب ہو رہے ہیں ویسے ویسے بلوچستان کی آزادی کی تحریک نیا رخ اختیار کر رہی ہے اور سندھ میں الگ صوبے کا ڈرامہ بھی زور پکڑ رہا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر کسی مرحلے پر امریکہ نے ایسا فیصلہ کیا تو پھر یہ صرف ایک الگ صوبہ نہیں بلکہ الگ ساحلی ریاست کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ جنوبی ایشیا کے بحیرہ عرب / بحر ہند میں عالمی طاقتوں کی اس نئی سرد جنگ میں کراچی ایک اہم مرکز بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچانک کراچی کی محرومی کا بے بنیاد راگ الاپنے کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ تمام ڈرامہ اس عظیم منصوبہ بندی میں حصہ لینے کی کوششوں کا حصہ ہے۔ عملی طور پر یہ سب کچھ کس طرح ممکن ہوگا، اس سے درجنوں سوال جڑے ہیں تاہم یہ چند غیر مصروف افراد کی ذہنی اختراع نہیں۔ اس مطالبے کے ڈرامے سے متعدد گہرے مفادات منسلک ہیں جو وقت کے ساتھ آشکار ہوں گے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ عالمی قوتوں کے تعلقات اور فیصلے اصولوں اور اقدار کی بنیاد پر نہیں بلکہ مفادات کے تحت ہوتے ہیں اور کراچی مفادات کی اس جنگ میں ایک اہم محاذ بن سکتا ہے۔

انتہا پسندی کی بھول بھلیاں

آج کل پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ یورپ کے دور جہالت سے مشابہت رکھتا ہے۔ آج کے یورپ کو ترقی کی ان منزلوں تک پہنچانے والی نشاۃ ثانیہ حقیقت میں رجعت پسندی پر عملیت پسندی کی فتح تھی۔ مارٹن لوتھر، کاپرنیکس، گلیلیو اور برونو نے یورپی معاشرے کو مذہبی رہنماؤں کے شکنجے سے نجات دلانے کیلئے چرچ کے اس تسلط کو چیلنج کیا جو تقریباً 1500 سالوں سے اس معاشرے کو جکڑے بیٹھا تھا۔ جب کاپرنیکس نے زمین کے کائنات کا محور کے نظریے کو غلط کہتے ہوئے سورج کو مرکزی حیثیت حاصل ہونے کا نظریہ پیش کیا تھا تو درحقیقت انہوں نے چرچ کے خود ساختہ آسمانی حکمت والے دعووں کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ اسی طرح برونو نے اس کائنات کے تسلسل بارے جب اپنا نظریہ پیش کیا تو روم کے جابر جرگے نے اس کے اوپر مذہب کے توہین کا الزام لگا کر اس کو زندہ جلا دیا۔ ایک طویل جنگ کے بعد عقل کو عقیدے پر فتح حاصل ہوئی اور سیاہ دور کی کوکھ سے نئے یورپ نے جنم لیا۔

ارادتاً حقائق کو پوشیدہ رکھنے کا رجحان عصر حاضر کے پاکستان پر حاوی ہے اور اس رجحان نے پاکستان کو سیاہ دور کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں روشن خیالی کو برداشت نہیں کیا جا رہا اور احساس برتری میں مبتلا مخصوص ذہن دلائل پر فقرے کستے نظر آتے ہیں۔ پاکستان پر مسلط اس انتہا پسندی کی جڑیں اسی دور میں گڑی ہیں جب ملک کی نظریاتی تخلیق ہو رہی تھی۔ قائداعظم کا اس ریاست کے مستقبل بارے ویژن ایک سیکولر اور ترقی پسند جمہوریت اور مسلمانوں کیلئے وطن والے نظریوں کے درمیان معلق تھا۔ حالانکہ 11 اگست 1947ء کو انہوں نے اپنے پہلے صدارتی

52

خطاب میں ریاست کے امور اور مذہب کے درمیان تعلق کے حوالے[61] سے اپنے خیالات واضح انداز میں بیان کر دیے تھے۔

قبل ازیں 1934ء میں پروفیسر تھامپسن کے لکھے ہوئے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے علامہ اقبال خود سے منسوب نظریہ پاکستان سے لاتعلقی کا اظہار کر چکے تھے۔ انہوں نے واضح طور پر کہا تھا کہ وہ پاکستان کے منصوبے کے قطعی طور پر حامی نہیں ہیں کیونکہ انہوں نے جو نظریہ دیا تھا وہ بھارتی وفاق کے اندر مسلمانوں کیلئے ایک صوبے کا تھا۔ مولانا مودودی بھی پاکستان کی تخلیق کے سخت خلاف تھے لیکن بعد میں فوج ان کو نہایت عزت و طمطراق سے نوتشکیل شدہ ریاست میں لے آئی جہاں پر ان کی ہم خیال اسلامی لابی پاکستان کے پاک وطن ہونے والے نظریے کے نگہبان بن بیٹھی۔ یہ رائے بھی عام ہے کہ لیاقت علی خان نے 1949ء میں قرارداد مقاصد پیش کر کے نئے قائم ہونے والے ملک کی تقدیر کا رخ ہی تبدیل کر دیا۔

سرد جنگ کی کوتاہ نظر پالیسیوں نے بھی پاکستان میں انتہا پسندی کو ہوا دی۔ سرخ انقلاب کا خوف امریکہ و برطانیہ اور رجعت پسند عناصر کو قریب لے آیا اور مغرب نے ان عناصر کو ڈھیل دیے رکھی۔ بدقسمتی سے اس وقت آزاد خیال اور سیکولر عناصر کو غدار قرار دیا گیا اور مذہبی انتہا پسند عالمی قوتوں کے چہیتے بن گئے۔ اس وقت کے امریکہ کی وزارت اطلاعات کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ وہ مخصوص اسلامی نظریات کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیں تا کہ کمیونزم کی لہروں کے آگے رکاوٹ پیدا کی جا سکے۔ یہ تمام حکمت عملی بنانے والوں کو اس وقت یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کہانی میں آگے چل کر وہ خود اس گڑھے میں گر جائیں گے جو وہ اپنے ہاتھوں سے کھود رہے ہیں۔

مفادات پر مبنی ایسی پالیسیوں کے تسلسل کے نتیجے میں امریکہ اور مغربی ممالک پاکستان میں ہر نئے آنے والے آمر کی پشت پناہی کرتے ہوئے نسبتاً ترقی پسند اور آزاد خیال قیادت کو کونے سے لگا کر رکھا۔ اس کی ایک بہت بڑی مثال ذوالفقار علی بھٹو ہے جس کو اپنی جمہوری اور آزاد خیال پالیسیوں کی وجہ سے پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ بھٹو کے اردگرد اس طرح گھیرا تنگ کیا گیا کہ اس کے پاس مذہبی جنونیوں کے آگے ہار ماننے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں بچا۔ ان کو خوش

کرنے کیلئے ذوالفقار علی بھٹو نے بہت بڑے اقدام اٹھائے جن میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینا' شراب پر پابندی عائد کرنا اور جمعہ کے روز ہفتہ وار سرکاری تعطیل کا اعلان شامل ہیں۔ 1973ء کے آئین میں پہلی مرتبہ یہ شق رکھی گئی کہ کسی بھی سرکاری عہدے کیلئے اسلامی نظریے کے تحفظ کیلئے کوششیں کرنے کا حلف اٹھایا جائے گا جو کہ پاکستان قائم ہونے کا بنیاد ہے مگر یہ سارے اقدام سودمند ثابت نہیں ہوئے اور آج کی آزاد دنیا میں جمہوریت کے بلند بانگ دعوے کرنے والوں نے ذوالفقار علی بھٹو کو مشکل وقت میں بے یارومددگار چھوڑ دیا تھا۔

سب سے بڑا ستم ضیاء الحق نے ڈھایا' انہوں نے معاشرے کی رگ رگ میں انتہاپسندی کا زہر بھر دیا۔ افغانستان پر سوویت یونین کی فوج کشی اس کے ارادوں کیلئے آسمانی مدد بن کر آئی۔ انہوں نے اپنے درباریوں سے مل کر اس ملک کی قسمت کو ہمیشہ کیلئے مذہبی انتہاپسندی کی گہری دلدل میں دھکیل دیا' اس دور میں انتہاپسندی اور مذہبی وفرقہ وارانہ تعصب کو ادارہ جاتی صورت ملی جس نے آنے والے عشروں میں اپنے ہی تخلیق کرنے والوں کو ڈس لیا۔

پاکستان کو افغان جنگ کیلئے متبادل میدان بنانے کے فیصلے نے اس ملک کے معاشرتی تانے بانے کی صورت ہی بگاڑ دی۔ یہاں تک کہ جنرل ضیاء الحق نے قائداعظم کے اتحاد' یقین' محکم اور تنظیم والے نعرے میں تبدیلی لاتے ہوئے ایمان' تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ کا نعرہ دیا۔

''کراسڈ سوارڈس'' کے مصنف شجاع نواز کے مطابق ضیاء الحق نے انتہاپسندوں کو پاکستان ملٹری اکیڈمی میں تبلیغ کی اجازت بھی دے دی اور تبلیغی جماعت کے مبلغ پی ایم اے میں جمعہ کا خطبہ دیتے تھے۔ آگے چل کر جنرل آصف نواز نے اس سلسلے کو ختم کیا۔ ضیاء نے مختلف صورتوں میں مذہب کی انتہاپسندانہ تشریح نافذ کی' انہوں نے سرعام سزا دینے کیلئے قانون سازی کی اور لوگوں کے ذہنوں کو کمزور کرنے اور ڈرانے کیلئے ہر قسم کا طریقہ استعمال کیا۔ بڑی تعداد میں مدرسوں کا جال بچھانے کے نتیجے میں نئے نسل کے ذہنوں میں بھی رجعت پسندی کا بیج بویا گیا اور آگے چل کر اس کا پودا طالبان کی صورت میں سامنے آیا۔

کرائسز گروپ کی ایک رپورٹ کے مطابق 1947ء میں پاکستان کے اندر صرف 137 مدرسے تھے' 1979ء میں یہ تعداد 1745 ہو چکی تھی جبکہ 1988ء تک یہ تعداد تیزی سے

بڑھتی ہوئی 3 ہزار تک جا پہنچی' وہ سلسلہ ضیاء کے وفات کے بعد بھی جاری[61] رہا۔ سرکاری اعداد وشمار خود یہ بتاتے ہیں کہ 2003ء میں مدرسوں کی تعداد 10 ہزار 430 تھا جبکہ ایسے مدرسے تو شمار ہی نہیں ہوتے جو رجسٹرڈ نہیں۔

افغان جنگ کے بعد ان مدرسوں کو جہادیوں کی نرسری بنایا گیا اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ آگے چل کر یہی مدرسے جہادیوں کی تربیت گاہ بھی بنے۔ مدرسوں کے تعداد میں اتنی تیزی کے ساتھ اضافہ بین الاقوامی مالی اور فنی سرپرستی کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا خواہ وہ اسلامی ہو یا سیکولر۔ جو اسٹیفنز اور ڈیوڈ بی اوٹاوے نے 23 مارچ 2002ء کو واشنگٹن پوسٹ میں شائع ہونے والے اپنے ایک آرٹیکل ''دی اے بی سی آف جہاد ان افغانستان'' میں انکشاف کیا کہ دری اور پشتو زبانوں میں خاص نصابی کتب شائع کی گئیں تاکہ جہادی قدروں اور فوجی تربیت کو فروغ دیا جا سکے۔ یہ کتب اوماہا کی یونیورسٹی آف نیبراسکا میں قائم سینٹر فار افغان اسٹڈی میں تیار کیے گئے تھے۔ افغان پناہگزینوں کے کیمپوں اور پاکستانی مدرسوں میں ایک کروڑ 30 لاکھ کے قریب یہ کتب تقسیم کی گئیں۔ جہاد پاکستان کیلئے یہ ورثہ چھوڑ کر گیا۔

افغان جنگ تو ختم ہوگئی لیکن انتہاپسندی کے بارودی سرنگیں آج بھی پاکستان میں جابجا بچھی ہوئی ہیں۔ سوویت یونین کے افغانستان سے انخلا کے بعد امریکہ کا ہاتھ سمیٹ کر ایک جانب ہو جانا بھی ایک بہت بڑی غلطی تھی جس پر امریکہ آگے چل کر پچھتایا بھی بہت ہے۔

کئی دہائیوں پر محیط انتہاپسندی کے اس نفوذ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے معاشرے میں تحمل وبرداشت کا فقدان ہے اور دوسروں کے عقائد کیلئے نفرت جڑیں مضبوط کر چکی ہے۔ مذہب اور فرقوں کے ناموں پر پیدا کی گئی ان دراڑوں نے پاکستانی معاشرے کو تقسیم در تقسیم کر دیا ہے۔

ایک سہمے ہوئے ساتھی سے لیکر صف اول کے حلیف تک کے اس سفر میں پاکستانی شہریوں کو بین الاقوامی ناپسندیدہ مفادات' بدخواہ مقامی آمروں اور اساس سے متصادم مذہبی سوچ کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ انتہاپسندی کی ان بھول بھلیوں سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہا۔ سیاسی بصیرت' سماجی اصلاحات اور خوشحال معیشت اس پیچیدگی کا حل پیش کر سکتے ہیں اور اس کیلئے ملک میں جمہوریت کو تقویت دینے کی ضرورت ہوگی۔

اگر عالمی طاقتیں اس علاقے کو انتہا پسندی کے شکنجے سے آزاد کرانے کے دعوے سے واقعی مخلص اور سنجیدہ ہیں تو پھر اس کا حل پاکستان میں جمہوریت کے استحکام میں موجود ہے۔ چھ دہائیوں تک آمریت کو مسلسل آزمانے کے بعد اب آنے والی دہائیوں میں جمہوریت کو مستحکم ہونے کا موقع ملنا چاہیے۔ اس ملک کے عوام کو اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے اور پاکستان اور خطہ کو انسانیت کی آماجگاہ بننے دیا جائے۔

پیپلز پارٹی کی سیاسی تاریخ کا تجزیہ

سندھ کی تاریخ کا جب بھی سیاسی تجزیہ کیا جائے گا، پیپلز پارٹی اس کا کلیدی حصہ رہے گی. ایک ایسی پارٹی جس نے تقسیم کے بعد سندھ میں عوامی سیاست کا بنیاد رکھی اور بھٹو خاندان اپنی متضاد شخصیات کے باوجود لازوال قربانیوں کے طفیل ایک دیو مالائی کردار بن کر عوام کی دھڑکنوں میں چار دہائیوں سے راج کر رہی ہے. بذات خود ملکی سیاست کا تاریخی تجزیہ کرتے وقت، ضرورت اس امر کی ہے کہ پیپلز پارٹی کو غیر معمولی مظہر کے طور پر سیاسی حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی جائے. پیپلز پارٹی کا ایسا تجزیہ تاریخی حقائق کی روشنی میں جذبات، عقیدت اور تعصّبات سے بالاتر ہوکر کرنا ہوگا. روزنامہ جیجل کی طرف سے شروع کی گئی یہ بحث سندھ کی سیاسی تاریخ تک رسائی کی طرف ایک اہم قدم ہے.

پیپلز پارٹی کے سیاسی تجزیے کے لیے میں اسے تین ادوار میں تقسیم کرنا چاہوں گا. ایک شہید بھٹو کا دور، دوسرا شہید بینظیر کا دور اور تیسرا بینظیر کی شہادت کے بعد کا دور. پیپلز پارٹی کی یہ تینوں ادوار ہمعصر سیاست کے ایک دوسرے سے قدرے مختلف ادوار تھے اور پیپلز پارٹی کے ان تینوں ادوار میں، اس وقت کی حقیقتوں کے پس منظر کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ویسے تو پیپلز پارٹی کا سیاسی جائزہ ایک سے زیادہ پی ایچ ڈی ڈگریوں کا مستحق ہے مگر اخبارات پڑھنے والوں کے لیے ان مضامین میں ایک مختصر تجزیہ کیا گیا ہے۔

55

پہلا دور: شہید ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی

61

ساٹھ کی دہائی میں جن حالات میں پیپلز پارٹی نے جنم لیا اس دور کے لحاظ سے وہ ایک ترقی پسند پارٹی تھیں۔ ایوبی آمریت کے آخری سال مغلیہ سلطنت کے ڈوبتے سالوں کی طرح اندرونی انتشار کے سال تھے۔ حکومتی اور انتظامی نظام آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی سحر انگیز شخصیت اور ہندستان دشمنی پر مبنی تقاریر والے انداز کی وجہ سے پنجاب کی سول اور ملٹری اسٹیبلشمینٹ کے اندر اپنے لیے قبولیت پیدا کر دی تھی۔ عوامی سطح پر مقبولیت کے لیے اس نے روٹی، کپڑا اور مکان کا زبردست نعرہ عام کیا اور نچلے طبقوں کے دلوں کو گرما دینے والی تقاریر سے ان کی دلوں میں جگہہ پیدا کر لی تھی۔ اسی طرح متوسط طبقے کے پڑھے لکھے لوگوں اور ترقی پسند قوتوں کے لیے اس نے سوشل ازم کا نعرہ لگا کر ان کی دلوں میں جگہ بنائی۔ یہی بھٹو کی شخصی ذہانت اور جاذب شخصیت تھی جس نے ایک ہی وقت فوج، پنجاب کی اسٹیبلشمینٹ، ملک کے محروم طبقوں اور آمریت سے بیزار مڈل کلاس کے پڑھے لکھے لوگوں کے ہاں قبولیت حاصل کی۔ لاتعداد تضادات سے بھرے ہونے کے باوجود اس کے پاس سب کو دینے کے لیے کچھ نہ کچھ موجود تھا۔ ایک ایسی مملکت جو جنم لیتے ھی سول اور ملٹری آمریتوں کے گود میں پلی بڑھی اور جب عوامی رائے کے حوالے سے کسی بھی چیز کے احترام کا تصور تک نہیں تھا، اس نے جمہوریت اور سوشل ازم جیسے تصورات کو عام کر کے عوام کے آنکھوں میں نئے نویلے خواب سجائے اور دلوں میں امیدوں کے لیے گرمجوشی پیدا کر دی تھی۔ یہ تو تھا بھٹو کی سحر انگیز شخصیت کا ظاہری پہلو۔ تاہم عملی طور پر بھٹو ان سب نعروں اور پروگراموں سے اتنا ربط نہیں رکھتے تھے جتنا کہ ظاہری طور پر نظر آتا تھا۔ ان کی جمہوریت پسندی کا بڑا اظہار بنگالیوں کے ملکی اقتدار پر جائز حق کے انکار کی شکل میں ظاہر ہوا۔ عوامی لیگ جو کہ پیپلز پارٹی کے مقابلے میں دگنی نشستیں لے کر قومی اسمبلی میں کامیاب ہوئی تھی اور ملکی اقتدار پر اس کا جائز حق تھا، ان کو روکنے کے لیے آرمی اور پنجاب کی اسٹیبلشمینٹ نے بھٹو کو استعمال کیا۔ بھٹو اقتدار کی خواہش اور اسٹیبلشمینٹ سے وفاداری کی دوڑ میں جمہوریت کے بنیادی اقدار کے انکاری بن گئے اور آج تک ان کا شمار مشرقی پاکستان میں ہونے والے تاریخی قتل عام کے اہم ذمہ داروں میں ہوتا ہے۔ تاریخ کے ان تلخ حقائق سے انکار ایک ایسا

شخص ہی کرسکتا ہے جس نے آنکھوں پر پٹیاں باندھی ہوئی ہوں۔ بعدازاں انہوں نے ہندستان میں یرغمال ۹۰ ہزار پاکستانیوں کو آزاد کرانے میں اہم کردار ادا کیا اور اس غلط فہمی کا شکار رہے کہ پنجاب کی سویلین اور ملٹری اسٹیبلشمینٹ اس کی غیر معمولی وفاداری کا جائز انعام دیگی۔ کوئی بھی ایماندار جمہوریت پسند اور سوشلسٹ خیالات کا شخص ایسا کچھ کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا جو بھٹو نے بنگلا دیش کے ساتھ کیا۔ ۱۹۷۲ء میں باقی بچے ہوئے ملک کی باگ دوڑ سنبھالنے کے بعد انہوں نے چند ایسے اقدام کئے جن پہ کچھ مقتدر قوتیں ان سے ناراض رہنے لگیں۔ ان میں بڑے پیمانے پر خانگی ملکیتوں کو نیشنلائیز کروانا، اسلامی بلاک کو آگے لے کر چلنا اور زمینی اصلاحات شامل تھے۔ اگرچہ ایسے اقدامات بھی اندرونی کمزوریوں کا شکار تھے مگر پھر بھی ہمعصر سیاسی ماحول میں یہ غیر معمولی اقدامات تھے۔ اسٹیبلشمینٹ اور آرمی سے وفاداری کرتے ہوئے بھٹو نے ایک اور دل دکھانے والا کام بلوچستان میں آرمی آپریشن کا کروایا۔ نیشنل عوامی پارٹی [نعپ] کی حکومتیں توڑ کر جمہوریت کے بنیادی روح سے انکار کیا۔ ۱۹۷۳ء کا آئین جس کو ملکی تاریخ کا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے، اس میں قوموں کی تاریخی پہچان سے انکار کیا گیا اور غیر مسلم کے لیے صدر بننا غیر قانونی قرار دیا گیا۔ اسی طرح جب مذہبی قوتیں اس کے خلاف ہوئیں تو اس نے قادیانیوں کو کافر قرار دینے، جمعہ کو عام تعطیل قرار کرنے اور شراب پر پابندی لگا کر ان کو خوش کرنے کی کوشش کی۔ اتنی ڈھیر ساری وفاداریوں اور خدمات کے باوجود مذہبی قوتوں اور فوج نے مل کر کہ بھٹو کو تختہ دار پہ لٹکا دیا اور جن ۹۰ ہزار پاکستانیوں کو بنگالیوں کے قتل عام میں ملوث ہونے کے باوجود بھٹو نے ہندستان سے رہائی دلا کر ان کو جوابدہ ہونے سے بری رکھا ان میں سے نوے لوگ بھی بھٹو کی جان بچانے کے لیے باہر نہ نکلے۔ اس بات میں کسی قسم کا شبہ نہیں کہ جیل کے آخری دنوں میں ایک نڈر سندھی کے طور پر انہوں نے آمروں کے آگے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دیا اور غیر معمولی انسانی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے تختہ دار کو قبول کیا۔ بھٹو کی ذات کے تمام گناہ ۴ اپریل ۱۹۷۹ء میں اس وقت دھل گئے جب انہوں نے ذلت کی زندگی کے مقابلے میں جراتمندانہ موت قبول کی اور پیپلز پارٹی اور بھٹو ملک میں قربانی، جرات، آمریت سے انکار اور عوام کے لیے جدوجہد کا استعارہ بن گئے۔ شاید بھٹو اپنی زندگی میں اتنے عظیم نہ تھے، جتنا کہ سولی پہ چڑھ جانے کہ بعد۔ بھٹو اقتدار

کے سالوں میں بہرحال ماضی کے پاکستان کی نسبت ایک مختلف سیاسی کلچر عام ہوا اور اگر بھٹو اپنی ذہانت کو سیاسی ایمانداری سے جوڑ کر عوامی صفوں سے ربط برقرار رکھتے تو شاید آج کا پاکستان قدرے مختلف ہوتا۔ اسٹیبلشمنٹ کے پاس بھٹو کو قبول نہ کرنے کے تین اہم اسباب تھے۔ ایک تو بھٹو مقبول عوامی رہنما تھے اور اسٹیبلشمنٹ کو یہ اندیشہ تھا کہ بھٹو چاہے ان کی کتنی بھی خدمت کرے لیکن عوام سے اس کا مضبوط رشتہ کبھی بھی اس کو عوام کے مفادات کی طرف کھینچ سکتا ہے جس سے غیر جمہوری قوتوں کا اقتدار پہ ظاھری یا خفیہ قبضہ ختم ہوسکتا تھا۔ دوسرا یہ کہ بھٹو بہرحال ایک سندھی تھے اور بنگلا دیش بن جانے کے بعد سندھ اور بلوچستان میں قومی حقوق کی تحریکوں میں تیزی آرہی تھی۔ بنگلا دیش کی علیحدگی کے بعد، پنجاب کے ملکی اقتدار پہ قبضے کہ لیے ان دونوں صوبوں کے قدرتی وسائل اھم تھے۔ بندرگاہیں، تیل، گئس، کوئلہ اور دھاتوں والی معدنیات سندھ اور بلوچستان میں تھیں۔ اس لیے اسٹیبلشمنٹ کو یہ خطرہ تھا کہ بھٹو کسی وقت بھی سندھ کی قوم پرست سیاست کو ہائی جیک کرکہ اسٹیبلشمنٹ سے لڑسکتا ہے۔ تیسرا یہ کہ بھٹو بین الاقوامی امور اور سفارتکاری کے ماہر تھے اور عالمی برادری، خاص طور پہ اسلامی ملکوں میں وہ آرمی اسٹیبلشمینٹ سے زیادہ مقبول تھے۔ ان کی عالمی مقبولیت بھی ملکی اسٹیبلشمنٹ کے لیے خطرہ تھی کیونکہ خارجہ پالیسی کے معاملات میں بھٹو پہ اپنی مرضی شاید وہ زیادہ دیر تک نہیں چلا پاتے۔ آمریکہ اور مغرب کی بہ نسبت چین اور روس کی جانب جھکاؤ رکھنے والے بھٹو سرد جنگ کیا ہم ترین کھلاڑیوں کو قبول نہ تھی اور اسی لیے ان کو ہٹا دیا گیا۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ساٹھ اور ستر کی دہائیوں کی پیپلز پارٹی، اگرچہ لاتعداد تضادات کا شکار تھی پر اپنے مکمل جوہر میں اس کا جھکاو اسٹبلشمنٹ کی طرف سے ہٹ کر کہ عوام کی جانب بڑھنے کے امکانات بھی موجود تھے۔ اس دور کی پیپلز پارٹی نسبتاَ ایک ایسی قوت تھی، جس میں اُس دور کے تاریخی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ وہ دور بھٹو کی شہادت سے اختتام پذیر ہوا اور ملکی تاریخ میں ایک ایسا طوفان برپا کر گیا جس کے میں واضح اثرات آج تک ملکی سیاست نظر آرہے ہیں۔ سندھ کے حوالے سے بھٹو کا دور نسبتاً بہتر دور تھا۔ اس نے کوٹا سسٹم اور لٹیرل انٹری کو متعارف کروا کر مڈل کلاس کو اھم دھارے میں شامل ہونے کا موقع فراہم کیا۔ سندھ میں اعلی تعلیمی اداروں کے ذریعے مڈل کلاس کی موجودہ نسل

کی بنیاد بھٹو کے دور میں ہی رکھی گ ۓ۔ ملک بننے کے بعد پہلی دفعہ سندھیوں کو نفسیاتی طور پر ملکی معاملات میں شمولیت کا احساس ہوا۔ سندھ میں سندھی زبان کے معاملے میں اگر چہ بھٹو شہری سیاست کا دباو؟ برداشت نہیں کر پائے اس کے باوجود سندھ اسمبلی میں سندھی زبان کا بل لانا ایک اہم سنگ میل تھا۔ البتہ سندھی ادیبوں اور شاعروں کی جانب ان کا رویہ غیر ضروری طور پہ ٹکراو؟ والا رہا۔ بہت سی سندھی رسالوں اور کتابوں پہ بندش لگائی گئی اور ادیبوں کو مخالف خیالات رکھنے کی پاداش میں جیل بھیجا گیا۔ ان معاملات میں بھٹو کی شخصیت عملی طور پہ جمہوری اقدار سے ٹکراو؟ میں رہی۔ مجموعی طور پہ سندھ کے لوگوں نے بھٹو کو ایک سندھی وزیر اعظم کے طور پہ داد و تحسین دی اور اس کی پھانسی کو سندھیوں پہ حملہ سمجھتے ہوئے اس کی قربانیوں کے صلے میں اب تک ان لوگوں کو بھی ووٹ دیے ہیں، جو کہ بھٹو کو قتل کرانے والی طاقتوں کے معاون رہے۔ سندھی لوگوں نے جیے بھٹو کے نعرے پہ ایسے افراد کو بھی ووٹ دیے جن کی انگلیوں پہ آج بھی بھٹو کے خون کے نشان موجود ہیں۔ مجموعی طور پہ بھٹو شہید کا دور تقسیم کے بعد ملکی تاریخ میں پہلی بار سندھیوں کا اہم قومی دہارے میں شمولیت کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک اہم سبب بنگلا دیش بن جانے کہ بعد سندھ میں قوم پرستی کے بڑھتے اثرات کو روکنا تھا۔

دوسرا دور: بینظیر کی پیپلز پارٹی:

پیپلز پارٹی کا دوسرا دور بھٹو کی شہادت سے لے کر کہ بینظیر بھٹو کی شہادت تک گنا جا سکتا ہے۔ اس دور میں پیپلز پارٹی خاص طور پہ ایک تحریک میں تبدیل ہوگئی اور اس نے آمریت کے خلاف عوامی مزاحمت کو رہنمائی مہیا کی۔ بینظیر بھٹو اور نصرت بھٹو نے ضیاً کی آمریت کے خلاف عوامی مزاحمت کو شاندار طریقے سے منظم کیا۔ ایم آر ڈی تحریک کے دوران سندہ کے باشندوں نے بھٹو کی شہادت کے خلاف اپنی نفرت کا بھرپور اظہار کیا۔ بھٹو کی شہادت نے سندھ میں قوم پرستی کی ایک جدید لہر کو جنم دیا اور بدترین ریاستی تشدد کے باوجود سندھ کے لوگوں نے شاندار مزاحمتی جدوجہد کی۔ سندھ کے اندر اس تحریک کو نچلی سطح پر دوسری تنظیموں نے بھی منظم کیا، جس میں خاص طور پر عوامی تحریک کا بھی بڑا کردار تھا۔ اگر چہ قوم پرست تحریک سائیں جی ایم سید

کی قیادت میں اس تحریک سے لاتعلق رہی، جس کا ایک اہم سبب ایم آر ڈی[61] تحریک کا سندھ کے مفادات سے زیادہ جمہوریت کی بحالی سے جڑا ہوا ہونا تھا، جس کو قوم پرست تحریک سندھیوں کے نجات کا ذریعہ نہیں سمجھتی تھی۔ بینظیر بھٹو نے ۹۱۶۸ع میں واپس آ کر کہ پیپلز پارٹی کو ازسرِنو منظم کیا، جس پارٹی کو بھٹو کے اکثر دوست کڑے وقت میں چھوڑ چکے تھے۔ بینظیر بھٹو بھی اپنے والد کی طرح ایک جاذب شخصیت تھیں اور سیاسی حوالے سے اس کی اپنی جدوجہد کے سبب یہ کہنا غلط ہوگا کہ ان کو پارٹی صرف ورثے میں ملی تھی۔ بینظیر بھٹو چاروں صوبوں میں اتنی ہی مقبول تھیں اور مڈل کلاس کے سوشلسٹ رجحانات رکھنے والے حلقوں میں بھی اس کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ مگر اسٹیبلشمنٹ نے اس کو اتنی آشیرواد نہ دی جتنا کہ ذوالفقار علی بھٹو کو حاصل تھی۔ ۸۸۹۱ع کے انتخابات میں اس نے زبردست عوامی حمایت سے کامیابی حاصل کی اور ملک کی پہلی خاتون وزیر اعظم بن گئیں، جس نے بہت سی طاقتور قوتوں میں صف ماتم بچھا دی۔ ایک طرف ان کو ناتجربے کاری کی وجہ سے حکومتی معاملات میں اندرونی چیلینجز درپیش تھے تو دوسری طرف ملک کی مکار اسٹیبلشمنٹ نے ان کو ایک دن بھی آرام سے بیٹھنے نہ دیا۔ بینظیر بھٹو کے دور میں بھی پیپلز پارٹی ہمعصر سیاسی تقاضاؤں پر بڑی حد تک پورا اترتی تھیں۔ اس دور میں پیپلز پارٹی کی پہچان درجہ ذیل اہم حوالوں سے تھی۔

۱۔ اسٹیبلشمنٹ مخالف سیاسی طاقت جس نے چاروں صوبوں میں جمہوریت پسند اور ترقی پسند عوام کو متحرک کیا اور آمریتی طاقتوں کو للکارنے کی جرات کی تھی۔

۲۔ ایک نسبتاً ترقی پسند جماعت جس کا انحصار مذہبی انتہاپسندی اور ہندستان دشمنی پہ نہیں تھا بلکہ ایک معتدل روشن خیال قوت جو ملک میں بڑھتی ہوئی مذہبی جنونیت کی حامی نہ تھی۔

۳۔ ایک ایسی جماعت جس کا کوئی غیر معمولی انقلابی پروگرام تو مرتب نہ تھا۔ مگر وہ مجموعی طور پہ ملک کے اندر جمہوری نظام کو مظبوط کر کہ کمزور طبقوں کو آگے بڑھا سکتی تھی۔

پیپلز پارٹی اس مکمل عرصے یعنی اپنے مختصر حکومتوں کے ماسوائے باقی وقت آمریتوں سے ٹکراتی رہی، ملکی ایجنسیوں سے لے کر اسٹیبلشمنٹ کے حامی گروہوں نے اس پارٹی کو مسلسل چاروں اطراف سے باندھے رکھا۔ اس عرصے میں پیپلز پارٹی کی دونوں حکومتیں اپنی مقررہ میعاد سے پہلے ہی ختم کر دیں گئیں۔ اس کا حکومتی دور کرپشن، اقربا پروری اور انتظامی نااہلی کا شکار بھی رہا۔

سندھ کے حوالے سے بینظیر بھٹو کے حکومتی ادوار نامکمل امیدوں کے دور تھے۔ دونوں بار شہروں میں سیاست کرنے والی دہشتگرد طاقتوں نے اسٹیبلشمنٹ کے اشاروں پہ بینظیر بھٹو کی حکومتوں کو گرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ سویلین اور آرمی اسٹیبلشمنٹ نے کبھی بھی اس کو ملکی رہنما کے طور قبول نہ کیا۔ سندھ میں بینظیر کی حکومتوں کے دوران بڑی مدت والی ترقیاتی اسکیمیں شروع کی گئیں مگر ان اسکیموں کو حکومتیں ختم ہونے کے بعد نواز لیگ حکومت نے بند کر دیا۔ پیپلز پارٹی کے اقتدار سے الگ رہنے کے عرصے یعنی نواز لیگ کی حکومتوں کے دوراں سندھ میں جام صادق اور عرفان مروت جیسے سندھ دشمن چہروں کو نامزد کیا گیا اور سیاسی مخالفین کے لیے زمین تنگ کر دی گئی۔ حمایتیں اور ہمدردیاں بدلنے کے ماہر وڈیرے ہر دفعہ پیپلز پارٹی کو چھوڑ کر ہزاروں ساتھیوں کے ساتھ پ پ مخالف حکومتوں میں شامل ہوجاتے اور بینظیر کے اقتدار میں آتے ہی ان کو بھٹو کی شہادت یاد آجاتی تھی۔ اقتدار پہ وہ ابن الوقت گروہ اس وقت بھی قابض رہا پھر بھی بینظیر بھٹو کی اپنی شخصیت سندھ میں ہمیشہ مقبول رہی۔ مکمل ناانصافیوں اور رنجشوں کے باوجود بیلوث پارٹی کارکن ہر وقت پیپلز پارٹی سے جڑے رہے۔ بینظیر بھٹو سانس لیے بغیر مسلسل ملکی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف جدوجہد کی صف اول کے مورچے برسرپیکار رہیں۔ اس دور میں بھی اگرچہ سندھیوں کو پیپلز پارٹی سے بہت شکایات رہیں جس میں شہری جماعتوں سے اس کی نزدیکی، نوکریوں میں میرٹ کا مسئلہ اور کرپشن جیسے انتظامی معاملات شامل رہے لیکن مجموعی طور پر پیپلز پارٹی کو اپنے مزاحمتی کردار کے وجہ سے مقبولیت حاصل رہی۔ بینظر بھٹو کی حکومتوں کے دوران سندھیوں کی صوبے اور وفاق میں انتظامی معاملات میں نمائندگی بہت بہتر ہوا کرتی تھی۔ وفاقی

حکومت میں بینظیر بھٹو کے دور میں جتنے سندھی سیکریٹری ہوا کرتے تھے[61] اتنے زرداری صاحب کے دور میں نہیں رہے۔ سندھ کی ترقی اور سیاسی حقوق کے متعلق بینظیر بھٹو کے دور میں پیپلز پارٹی کا رویہ نسبتاً بہتر رہا اور سندھ کے پڑھے لکھے لوگوں سے ملک اور بیرون ملک قیام کے دوران وہ مسلسل رابطے میں رہا کرتیں تھیں تاکہ سندھ میں سماجی تبدیلی کے لیے کچھ بہتر پیش قدمی کی جاسکے۔ سندھ کے قومی سیاسی مفادات جیسا کہ کالاباغ ڈیم، این ایف سی ایوارڈ وغیرہ جیسے معاملات میں بھی پیپلز پارٹی حکومتوں سے باہر رہتے ہوئے بھی ہراول دستے کا کردار ادا کرتی تھی، جس کے لیے اس کو اسلام آباد اور لاہور میں سندھ کارڈ کا طعنہ ملتا رہتا تھا۔ کالاباغ ڈیم کے خلاف اینٹی کالاباغ ڈیم فرنٹ کی طرف سے لگائے گئے دھرنے میں بینظیر بھٹو کی ذاتی شرکت کو سندھ میں غیر معمولی اہمیت دی گئی۔ کچھ حلقوں کا یہ بھی خیال تھا کہ کل اگر اس خطہ اور ملک میں کچھ اہم اور بڑے فیصلے ہوئے تو بینظیر بھٹو سندھیوں کے قومی حقوق کے تحفظ کے لیے اہم کردار ادا کرسکتیں تھیں۔ اس امید میں کتنی خوشفہمی اور کتنی حقیقت پسندی شامل تھی، اس کے بارے میں مختلف پہلو ہوسکتے ہیں۔ کیٹی بندر پروجیکٹ جیسی پیش قدمیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بینظیر بھٹو کے دور والی پیپلز پارٹی کے پاس سندھ کے لیے ہمعصر دور کے تقاضات کو پورا کرنے کی صلاحیت اور سوچ موجود تھی۔ بینظیر بھٹو کو احساس تھا کہ سندھیوں کو منظم طریقے سے وڈیروں اور جاگیرداروں کی غلامی میں جکڑا گیا ہے اور سندھیوں کی نجات وڈیرا کلچر اور جاگیردارانہ سماجی نظام سے چھٹکارا پانے کہ سوا ممکن نہیں۔ اگرچہ بینظیر کے دور میں بھی موقع پرست وڈیرے پیپلز پارٹی میں آتے جاتے رہتے تھے مگر مجموعی طور پر پیپلز پارٹی پر وڈیروں کا قبضہ اتنا مظبوط نہ تھا اور پیپلز پارٹی کی پہچان پھر بھی کسی حد تک مڈل کلاس کی نمائندہ پارٹی کی تھی۔ سندھ کے اندر مڈل کلاس کے رہنماؤں کی ایک لمبی قطار پیپلز پارٹی کی نمائندگی کرتی تھی اور نچلے طبقوں کے کارکنوں کے لیے قیادت تک رسائی نسبتاً آسان ہوتی تھی۔ متوسط طبقوں کے اسمبلی میمبران اور وزراء تب بھی کرپشن کرتے تھے مگر آج کے دور کی طرح قیادت کی جانب سے مال کمانا ان کے فرائض میں شامل نہ تھا۔ اقتدار میں زیادہ عرصہ نہ رہنے اور زیادہ وقت مخالف حیثیت میں رہنے کی وجہہ سے سندھ کے قومی مفادات پر پیپلز پارٹی کا کردار بہت بہتر تھا۔ اقتدار کے مختصر برسوں میں پیپلز پارٹی مکمل طور پہ اسٹیبلشمنٹ سے ٹکراو؟ میں رہتی

تھیں اسے لیے مرکزی قیادت کے پاس نچلی سطح پہ ھونے والی بدعنوانیوں اور بدانتظامیوں کو سنبھالنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ پیپلز پارٹی البتہ مخالف جماعت والے ادوار میں ایک اثر پذیر مخالف قوت بن کر کے ابھرتی تھیں اور اس کا مزاحمتی کردار کافی پختہ ہوا کرتا تھا۔ یہی وجہہ ہے کہ سندھ کے اھم ترین مسائل جیسا کہ پانی اور آمدنی کی منصفانہ تقسیم پر مخالف جماعت کے طور پر پیپلز پارٹی وفاق میں متاثر کن کردار ادا کرتی تھی اور سندہ میں زیادہ طور پہ قوم پرست قوتوں سے مختلف کامیٹیوں میں بھی شریک کار رہا کرتی تھی۔ پیپلز پارٹی کا یہ دور اس کی مزاحمتی جوھر کے ساتھ جمھوریت کو پروان چڑھانے کے لیے مسلسل جدوجھد کا دور تھا، جو کہ بینظیر بھٹو کی شہادت سے اپنے اختتام کو پہنچا۔

تیسرا دور: آصف علی زرداری کی پیپلز پارٹی

59

تیسرا یعنی موجودہ دور بیتے ھوے دونوں ادوار سے قدرے مختلف ہے۔ اس سے پھلے سندھ میں پیپلز پارٹی ہمیشہ بھٹو خاندان کی رھنمائی کے بل بوتے پر سیاست کرتی تھی۔ اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ پیپلز پارٹی کی قیادت ایسے شخص کے پاس آئی، جو کہ بینظیر بھٹو کا خاوند تو ہے مگر خاندانی وراثت میں یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے آصف علی زرداری کو بھٹو خاندان کا حصہ تسلیم کرنا آسان نہ تھا اور اصولی طور پہ سیاست خاندانوں کی میراث نہیں ہونا چاہیے۔ ۸۰۰۲ع میں آصف علی زرداری کی پہچان ایک ایسے متضاد شخص کی سی تھی، جس پہ ایک طرف سابقہ حکومتی ادوار میں کرپشن کے سنگین الزامات تھے اور دوسری طرف بغیر ثبوت کے الزامات میں وہ سالہا سال سلاخوں کے پیچھے رہے۔ اور کسی بھی موقع پر اس نے وقت کے حکمرانوں کے آگے ہار نہیں مانی تھی۔ جو کہ سیاسی حوالے سے معمولی بات نہیں۔ البتہ ۸۰۰۲ میں اس نے جس طرح ایک پُراسرار وصیت کو بنیاد بنا کر پارٹی کی باگ ڈور سنبھالی، اس کے بارے میں بہت سے سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔ وصیت کا صحیح یا غلط ھونا ایک الگ بحث ہے۔ چونکہ ایک ایسی پارٹی جو ملک میں جمہوریت کی بقا کی جدوجہد کی دعویدار ہو، اس میں پارٹی کی رہنمائی کا تعین سیاسی اداروں کے

بجائے وصیت پہ کرنا اصولی طور پہ غلط راویت ہے۔ بہرحال اس وقت جب پورا ملک بینظیر کی
61
شہادت میں سوگوار تھا، ان سوالات پر زیادہ بحث نہ ہوسکی۔ مگر پھر بھی پیپلز پارٹی کے تیسرے دور کی شرعات غیر جمہوری انداز میں ھوئی۔ اور یہ رویہ پیپلز پارٹی کا موجودہ تعارف بنا ہوا ہے۔ اس دور میں پیپلز پارٹی ایک فرد کے فیصلوں کے ماتحت بن گئی۔ پارٹی ادارے اور کارکنان مفلوج ہوگئے اور نیچے سے اوپر تک کے پارٹی معاملات اور حکومتی امور کے متعلق سارے فیصلے آصف زرداری صاحب کے حکم کے محتاج بن گئے۔ پارٹی اجلاس یا تو ہوتے ہی نہیں یا پھر ہوتے ہیں تو وہاں حاضرین کو صرف سننے کی اجازت ہوتی ہے۔ یک طرفہ فیصلوں کا ثبوت سندھ میں دوہرے بلدیاتی نظام کو رائج کرنا اور واپس لینا ہے۔ جب کہ سندھ اسیمبلی میں یہی بل پیش ہوا تو ایک بھی رکن کو یہ جرات نہ ھوئی کہ اس بل کی مخالفت میں ووٹ دے سکتا۔ اور جب سندھی عوام کی سخت مخالفت کے بعد یہ بل واپس لینا پڑا تو انہی اسمبلی میمبران نے اس بل کی مخالفت میں یک رائے ووٹ دے کر ۱۹۷۹ع والا نظام بحال کیا۔ پیپلز پارٹی کیا ندر ذمہ دار لوگوں کی ھمہ تن گوش خاموشی اور تنہائی اس سے پہلے کبھی بھی نظر نہیں آئی۔ پیپلز پارٹی کے سینیئر رہنما کہتے ہیں کہ بینظیر بھٹو کے ادوار میں پارٹی کے اندر اہم معاملات پر بحث بھی ہوا کرتے تھے اور بینظیر صاحبہ مختلف رہنماوں کو سنتی تھیں۔ پارٹی کے اندر کسی بھی معاملے پر اختلاف رائے رکھنے پر کوئی بھی روک ٹوک نہ تھی۔ اس کے برعکس موجودہ پیپلز پارٹی کوئی تنظیم نہیں پر کچھ افراد کے تابع چلنے والے ایک گروہ میں تبدیل ہو چکی ہے، جہاں اختلاف رائے نام کی کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں۔ اوپر کی سطح پر زرداری صاحب اور اس کے ہم خیال کچھ لوگوں کی مرضی سے مکمل فیصلے ہوتے ہیں اور باقی ممبراں کے پاس ان سے متفق ہونے کے سوا کوئی بھی چارہ نہیں ہوتا۔ کچھ پارٹی رہنماؤں نے شروعات میں کچھ اختلافِ راۓ کی جرات کی مگر آھستہ آھستہ سبھی لوگ اُسی بہاؤ میں بہنے لگے یا پارٹی سے جدا ہو گئے۔

پارٹی کے حوالے سے دوسرا اھم سیاسی زوال یہ آیا کہ ماضی میں اسٹیبلشمنٹ اور اس کے حامی طاقتوں سے مخالفت میں رہنے کی جرات کرنے والی پارٹی سراپا اسٹیبلشمنٹ بن گئی۔

مفاھمت کے نام پر ہرایک جماعت اور فرد کے ساتھ بغیر حساب کتاب کے نئے رشتے جوڑے گئے،جس کا مقصد جمہوریت سے زیادہ اقتدار کو بچانا تھا۔سندھ میں ایم کیوایم اور وفاق میں قاتل لیگ قرار دی گئی جماعتوں سے مفاھمتیں ان کا واضح مثال ہیں۔سیاسی نظریے اور اصول ماضی کے افسانے بن گئے۔ویسے تو ایسی مصلحتیں بینظیر بھٹو کی حکومتوں میں بھی ہوئیں تھیں جب کراچی میں امن کی خاطر ھٹ دھرمی کی سیاست کرنے والوں کے ساتھ صلح کی گئی۔اور ان اشخاص کو جمہوریت کے تمغے پہنائے گئے جنہوں نے برسوں سے ملک کے اندر جمہوریت کو پاوں تلے روند رکھا تھا۔پر بینظیر بھٹو کی حکومتیں گزری ہوئی پ-پ حکومت کے مقابلے میں بہت کمزور تھیں۔اس کے برعکس ۸۰۰۲ع میں پیپلز پارٹی کو دیا گیا اقتدار گذشتہ ادوار سے زیادہ پختہ تھا کہ ایوان صدر میں آصف زرداری صاحب بذات خود موجود تھے۔اگرچہ ان دیکھی اور دیکھی طاقتوں کی جانب سے پیپلز پارٹی حکومت کو گاہے بگاہے مختلف بحرانوں میں الجھایا گیا اور آغاز سے ہی،ہر چھ ماہ میں حکومت کے خاتمے کی تاریخوں کا اعلان ہوا کرتا تھا۔کچھ ٹی وی چینلز اور اینکرز تو صبح وشام اس ڈیوٹی پر ہوا کرتے تھے کہ پیپلز پارٹی کی حکومت کا میڈیا ٹرائل جاری رکھا جائے۔ایسے ماحول میں پیپلز پارٹی نے وفاقی سطح پہ اٹھارویں ترمیم،این ایف سی ایوارڈ،کاؤنسل آف کامن انٹریسٹ کی بحالی اور عورتوں کے حقوق کے متعلق انتہائی اھم قانون سازی بھی کی۔وفاق میں پیپلز پارٹی کی حکومتی کارکردگی کچھ حوالوں سے بہتر رہی،البتہ پارٹی اداروں کی کمزوری،افراد کا فیصلہ سازی پہ کنٹرول،بجلی کے بحران اور روزمرہ کی خراب حکمرانی کی وجوہات کہ باعث پارٹی کے امیج کو نقصان پہنچا۔پنجاب میں بجلی کے بحران کے معاشی اثرات باقی تینوں صوبوں کے مقابلے میں زیادہ سنگین ہوئے،ادھر نچلی اور درمیانی صنعت پر لاکھوں افراد کی معیشت کا دارومدار ہے اور بجلی کے بحران کا پنجاب میں مطلب معاشی بحران پیدا کرنا ہے۔اس کے علاوہ صدر زرداری اور ان کے من پسند قریبی ساتھیوں کے کرپشن کے قصے تو اتنے عام ہوگئے کہ حکومت کہ متعلق بدعنوان ہونے کا تصور گلی گلی میں عام ہوگیا۔پارٹی اداروں کی کمزوری کی وجہہ سے پارٹی کے اندر جرات مند لوگوں کے لیے کوئی بھی جگہ باقی نہ رہی اور انگلیوں پہ گنتی جتنے لوگوں کو چھوڑ کر باقی اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کا کام صرف مال کمانا رہ گیا تھا۔پیپلز پارٹی اسٹیبلشمینٹ کو چکمہ دینے کے لیے

پانچوں سال ہی اتحادیوں کی ایسی فرمائشوں کو پورا کرنے میں مصروف رہی،جس سے اس کی سیاسی اھمیت مکمل ختم سی ہوچکی تھی۔کراچی اور بلوچستان میں لاشیں گرنے کا سلسلہ پہلے سے بھی زیادہ رہا مگر حکومت مفاھمت نبھانے کے چکر میں مجرموں کو روکنے کے بجائے ان کے نہ ختم ہونے والے مطالبات پورے کرنے میں مصروف رہی۔بلوچستان میں پیپلز پارٹی حکومت نے اربوں روپیوں کے اضافی فنڈز فراھم کیے جو کہ پارٹی رہنماؤں کی کرپشن کے بھینٹ چڑھ گئے۔اور بلوچ عوام اسی طرح ایک طرف غربت اور بدحالی کا شکار بنا رہا تو دوسری جانب کئی سو؟ گمشدہ بلوچوں کی مسخ شدہ لاش گھروں میں پہنچے۔سندھ کے حوالے سے پیپلز پارٹی کا تیسرا دور بہت بھیانک تھا۔سندھیوں کی حالت مشرف دور سے بھی دو قدم پیچھے چلی گئی۔سیاسی طور پر صوبے کے اندر ایسے نقصان دہ فیصلے کیے گئے،جو کہ مشرف جیسا آمر نے بھی نہیں کیے۔سندھ کی عوام کے لیے سندھ کی جغرافیائی وحدت سے بڑہ کر کہ کوئی بھی بات اھم نہیں مگر پیپلز پارٹی نے دو مرتبہ ایسا نظام متعارف کرایا،جس میں کراچی عملی طور پہ باقی صوبے سے جدا نظر آیا۔حکومت کی اتحادی جماعت کراچی میں کھلم کھلا الگ صوبے کی تحریک کی پشت پناہی کرتی رہی۔سندھی پہلے ہی عددی اقلیت میں تبدیل ہونے کی تلوار کے نیچے ھیں،ایسے حالات میں مردم شماری جیسے حساس معاملات کو بھی ایسی قوتوں کے حوالے کیا گیا،جنھوں نے اعداد وشمار کی ایسی جادوگری دکھائی کہ کوئی نابینا بھی ایسے اعداد وشمار پہ یقین نہ کرسکتا تھا۔اوپر سے سندھ میں ذوالفقار آباد کا اعلان کر کے سندھیوں کو اپنی ہی دھرتی پر اقلیت میں بدلنے کے انتظامات مکمل کیے گئے۔دوسری جانب سندھ میں تاریخ کی بدترین کرپشن کر کہ سندھ کے شھروں کا ڈھانچہ برباد کیا گیا۔لاقانونیت اور اغوا برائے تاوان کو ایک نیا عروج نصیب ھوا اور سندھ کے کتنے ہی علائقے دن کی اوقات کار میں بھی گھومنے کے قابل نہیں رہے۔کراچی کے اکثر علائقوں میں مختلف گروھوں کے ھتھیار بند ٹولے قابض ھیں۔اور اُدھر کسی کا بھی جانا محفوظ نہیں۔دیہات میں صنعتی جال بچھانے کے واعدے ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکے۔سندھیوں کو صرف بینظیر کارڈ کی خیرات کے ماہانہ ایک ھزار روپے نصیب ہوئے۔ماضی کی مقابلے میں میرٹ کی دھجیاں اڑانے کے انوکھے مثال قائم ہوئے اور پہلی دفعہ تبادلوں اور مقرریوں میں بدعنوانیوں کو قانونی شکل دینے کے لیے سندھ اسیمبلی سے مکمل قانونسازی کرائی

گئی۔ سندھ میں بدترین انتظامی مشینری مسلط کرتے ہوئے دیہات کی ترقی کو وڈیروں اور درمیانی طبقے کے نومولود وڈیروں کی کرپشن کی بھینٹ چڑھایا گیا۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سابقہ پانچ سالوں میں سندھ کے اندر جو بدترین حکمرانی دیکھی گئی۔ اس کی مثال ملکی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس طرح پیپلز پارٹی کا تیسرا دور سیاسی نظریے اور پروگرام کے بجائے شخصی حکومت کا دور تھے۔ پیپلز پارٹی کو بحیثیت جماعت جتنا نقصان اس دور میں پہنچا ہے اتنا پہلے کبھی بھی نہیں پہنچا تھا۔ پارٹی کی اس بصارت کا نتیجہ ۲۰۱۳ع کی الیکشن میں نظر آیا، جب ماسوائے سندھ کے باقی تینوں صوبوں میں پیپلز پارٹی کو عملی طور پر سیاسی شکست مل چکی تھے۔ اب چاروں صوبوں کی زنجیر کہلوانے والی ملک گیر پارٹی اپنی آخری پناہ گاہ سندھ تک محدود ہو چکی ہے۔ سندھ کے اندر بھی متبادل کی غیر موجودگی، انتظامی مشینری کی مدد سے کی گئی دھاندلیوں اور پانچ سالوں میں لُوٹے ہوئے عوامی خزانے سے خرچ کیے گئے کروڑوں روپیوں نے پارٹی کو کچھ سہارا دیا ہے۔ چناؤ سے پہلے صورتحال یہ بن چکی تھی کہ پارٹی عوام کے ٹھکرائے مشرف کے دوست وڈیروں کو پیپلز پارٹی میں شامل کرنے کے لیے مفاھمتی وفد بھیجتی رہی۔ یہی وڈیرے کتنا وقت پارٹی کا ساتھ دیں گے وہ تو وقت ہی بتائے گا۔ پیپلز پارٹی تاریخ کے تیسرے دور میں عوام کی شعور اور طاقت کو سیاسی مرکز بنانے کے بجائے سیاسی چالاکیوں، موقع پرستیوں، مفاھمتوں اور مصلحتوں کو اپنی سیاسی طاقت کا مرکز بنایا ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ عوامی سطح پہ اس کی مقبولیت میں اتنی نمایاں کمی آئی ہے کہ سندھ کے اندر اکثر جیتی ہوئی سیٹوں پہ ۲۰۰۸ع کی نسبتاً ان کے ووٹوں کی شرح بہت کم نظر آ رہی ہے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت کو بہرحال سندھ میں ایک مزید موقع ملا ہے، دیکھتے ہیں کہ پارٹی اس موقع کو کتنی ذمیواری سے استعمال کرتی ہے۔ آنے والے پانچ سالوں میں پارٹی قیادت جو فیصلے کرے گی وہی پارٹی کے مستقبل کا تعین کریں گے۔ ایک بات تو واضع ہے کہ اکیسویں صدی کے مہذب تقاضوں کو آج کی پیپلز پارٹی مکمل نہیں کر سکتی۔ پارلیمانی سیاست آج کے دور میں غیر جمہوری جاگیردارانہ رویوں اور عوامی مفادات کے بجائے اقتداری ترجیحات پر انحصار کرتے ہر قسم کے جرم کو مفاھمت کے نام پر جائز قرار دیتے ہوئے آج کی سائنسی اور تاریخی ضرورتوں کو مکمل نہیں کرتی۔ سندھ کے اندر روشن خیال متوسط طبقوں کو اپنے ساتھ لے چلنے کے بجائے ابن الوقت

وڈیروں کے ڈیروں پر چکر کاٹنا، پارٹی پروگرام اور منشور کے بجائے روزمرہ کے مفادات کے فیصلے کرنا، اپنے سیاسی قوت کے علائقوں کی عوام کو سنبھالنے کے بجائے موقع پرست طاقتوں کے مفادات کی چوکسی کرنا، شہروں کو جدید دور کے تقاضاؤں کے مطابق انسانی رہائش کے قابل بنانے کے بجائے ان کو کھنڈرات میں تبدیل کرنا، معاشرے میں صحت مند مقابلے کے رجحانات کے لیے میرٹ اور محنت کو جگہ دینے کے بجائے شارٹ کٹ کو سرپرستی دینے والی پارٹی اکیسویں صدی کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکی۔

اکیسویں صدی کا تعارف انسانی وقار، ترقی کے یکساں مواقع، اہلیت کی پزیرائی، صلاحیت کی ارتقا اور تاریخی حقوق کے احترام سے مشروط ہے۔ بدلتے عالمی سیاسی منظرنامے، ٹیکنالوجی خاص طور پر میڈیا کے انقلاب اور عالمی سطح پر جمہوریت اور سیکیولر اقدار کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے پیپلز پارٹی اپنے آج کی شکل میں ان معیارات پر پورا نہیں اترتی۔ سندھی سماج کو جدید دنیا سے میلوں دور پتھروں کیعھد کی طرف دھکیل کر ماتمی نغموں اور ایک ہزار روپیوں کی امدادی پروگراموں کے عیوض ووٹ وصول کرنے والی پارٹی کس طرح اکیسویں صدی کے تقاضوں کو پورا کر سکے گی۔ جس پارٹی کی حکومت میں سندھ کی یونیورسٹیاں فارغ البال عملداروں کو فقط ذاتی وفاداریوں کے صلہ میں ملیں ہوں، جب ہزاروں کی تعداد میں بنیادی تعلیم کے اداروں کو تالے لگے ہوئے ہوں اور بدامنی متوسط طبقے کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہو، وہ پارٹی انتخابات تو جیت سکتی ہے مگر اس سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ سماج کو اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ھم آہنگ کر کے کوئی باوقار مستقبل فراہم کر سکے گی۔ سندہ کو ایک ایسی پارٹی کی ضرورت ہے جو صرف انتخابات کو ایندھن کے طور پہ استعمال نہ کرے بلکہ اس کو جدید سیاسی اور سماجی تقاضوں پہ استوار قوم کا روشن کل مہیا کرنے کا شعور اور نیت رکھتی ھو۔ موجودہ دور کی چیلنجز کو سامنے رکھا جائے تو پھر پیپلز پارٹی سمیت سندھ میں کوئی بھی پارٹی انہیں تقاضوں کو مکمل نہیں کرتی اور تبدیلی کے اس طویل سفر کا ایک ہی حل ہے؛ یعنی مسلسل جدوجہد۔